قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک
سالانہ
پاکستان ——— ۴۸ روپے
غیر ممالک ——— ۱۱۰ روپے

ٹیلیفون
87 92 46
خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۴
چار روپے

نمبر ۱۲ | دسمبر ۱۹۸۷ء | جلد (۴۰)

فہرست

۱۔ نغمۂ محمدؐ ۲
۲۔ لمعات ۵
۳۔ میلادُ النبیؐ (نظم)۔ ڈاکٹر عارف بٹالوی ۱۳
۴۔ غمزۂ خونریز ۱۴
۵۔ دین کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے؟ (محترم پرویز صاحبؒ) ۲۱
۶۔ حسنِ تحریر۔ (مرتبہ: محترم محمد عمر دراز) ۲۳
۷۔ حقائق و عبر (۱) زکوٰۃ کی تقسیم کے دروازے ۳۵
(۲) شریعت بل پر فرقہ اہلحدیث میں باہمی کھلبلی
(۳) اسلامی انقلاب کیلئے فوجی ڈکٹیٹروں سے تعاون
(۴) فرقہ اہلحدیث اور ضعیف احادیث
۸۔ باب المراسلات ۴۰
۹۔ کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟ (قسط اول) محترم پرویز صاحبؒ ۴۳
۱۰۔ سرسید احمد خانؒ بحیثیت ایک ایجوکیشنسٹ (انگریزی) (محترمہ مس شمیم انور) ۵۷

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت: ۲۵/بی، گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۲/۴ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵۔

نغمۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ اقبال کے پیامِ مشرق میں "جوئے آب" کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے جس کے نیچے حسب ذیل نوٹ شائع ہوا ہے۔

"جوئے آب"، گوئٹے کی مشہور نظم موسومہ بہ "نغمۂ محمدؐ" کا ایک نہایت آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم میں، جو دیوانِ مغربی سے بہت پہلے لکھی گئی تھی، المانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اصل میں یہ ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی جس کی تکمیل اُس سے نہ ہو سکی۔ اس ترجمہ سے صرف گوئٹے کا نقطۂ نگاہ دکھانا مقصود ہے۔

جی چاہتا تھا کہ گوئٹے کی اس نظم کی اصل مِل جائے تو کسی جرمن زبان جاننے والے سے اس کا لفظی ترجمہ سنا جائے۔ با... شیخ الجامعہ (دہلی)، پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس نظم کا ترجمہ، اخبار مدینہ (بجنور) میں شائع کرایا ہے جسے ہم جرید... مذکورہ کے شکریہ کے ساتھ درجِ ذیل کرتے ہیں۔ عنوان ہے "محمدؐ کا گیت"۔

اُس چشمے کو دیکھو، جو ستاروں کی کرنوں کی طرح ہنستا ہوا صاف شفاف چٹانوں سے نکلا، بچپن میں اسے قدسیوں نے اس دنیا میں پالا جو بادلوں سے پرے ہے۔ شباب کی تازگی اور جوش لیے ہوئے وہ ایک خرامِ ناز کے ساتھ بادلوں سے نکلتا ہے اور چٹانوں کے بیچ میں سے جھاڑیوں سے گذر کر مرمریں چٹانوں پر گرتا ہے اور پھر مسرت کے نعرے لگاتا ہوا آسمان کی طرف اچھلتا ہے۔

وہ چوٹیوں کے درمیان درّوں میں سے ایک رنگین پتھر سے دوسرے کی طرف لپکتا ہے۔ اس کے قدم کو شروع ہی سے رہنمائی کی صفت عطا ہوئی ہے اور وہ اپنے بھائی بندوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔

نیچے وادی میں جہاں اس کا قدم پڑتا ہے پھول کِھلنے لگتے ہیں اور اس کے دم سے سبزہ زار میں جان پڑ جاتی ہے۔ لیکن اُسے نہ سایہ دار وادی روک سکتی ہے نہ وہ پھول جو اُس کے گھٹنوں سے لپٹ لپٹ کر محبت بھری آنکھوں سے اس کی خوشامد کرتے ہیں۔ اس کا بہاؤ اُسے میدان کی طرف جھکتا دیتا ہؤا لے جاتا ہے۔ چھوٹے چشمے اس کے دامن سے لپٹ کر چلتے ہیں۔ اب وہ چاندی کی طرح چمکتا ہوا میدان میں پہنچتا ہے اور میدان بھی اس کی آب و تاب سے چمک اٹھتا ہے۔ اب میدان کے دریا اور پہاڑوں کے چشمے پکار پکار کر کہتے ہیں۔

"بھائی اے بھائی، ہمیں بھی اپنے رب کے پاس لئے چل، ہمیں بھی بے پایاں سمندر کی گود میں پہنچا دے۔ وہ ہمارے انتظار میں ہاتھ پھیلائے ہے۔ اور افسوس، ہم اس کے مشتاق اس کی گود تک پہنچ نہیں پاتے۔ ہمیں ریگستانوں کی پیاسی ریت سوکھے لیتی ہے۔ اوپر سے سورج ہمارا خون چوسے لیتا ہے۔ کوئی پہاڑی راستہ روک کر ہمیں تالاب بنا دیتی ہے۔ اے بھائی، اپنے میدان والے بھائیوں کو، اپنے پہاڑ والے بھائیوں کو اپنے ساتھ اپنے رب کے پاس لئے چل۔"

"آؤ سب کے سب آؤ"۔۔۔ اب وہ بڑی شان سے موجیں مارتا بڑھتا ہے۔ ساری قوم اپنے بادشاہ کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے چلتی ہے اور فتح کے ریلے میں وہ ملکوں پر اپنا سکہ بٹھاتا جاتا ہے، جہاں اس کا پیر پڑتا ہے شہر آباد ہو جاتے ہیں۔

اُس کا بہاؤ کسی کے روکے نہیں رکتا، وہ زور شور سے میناروں کی چمکتی چوٹیوں، مرمریں عمارتوں کو پیچھے چھوڑ کر تخلیق کے جوش میں آگے بڑھا چلا جاتا ہے، گویا اطلس ایک دنیا کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے سر پر ہزاروں جھنڈے لہراتے اور سرسراتے ہیں، اور یہ سب اس کی شان و شوکت کے نشان ہیں۔

اس طرح وہ اپنے بھائیوں، اپنے عزیزوں، اپنے بچوں کو اُن کے رب کے پاس، جو ان کے انتظار میں تھا، پہنچا دیتا ہے اور وہ انہیں مسرت کے جوش میں گلے لگا لیتا ہے۔

کتنے پاکیزہ ہیں یہ خیالات اور کیسی بلند پایہ ہے یہ نعت۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظی ترجمہ کے ساتھ علامہ اقبال کا منظوم ترجمہ بھی سامنے آجائے وہو ہذا۔

جوئے آب

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود — مانند کہکشاں بگریبانِ مرغزار
در خوابِ ناز بود بہ گہوارۂ سحاب — دا کرد چشمِ شوق بآغوشِ کوہسار
از سنگریزہ نغمہ کشاید خرامِ او — سیمائے او چو آئینہ بے رنگ و بے غبار

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

در راہِ او بہار پریخانہ آفرید — نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست — خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید

نا آشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

صد جوئے دشت و مرغ و کہستان و باغ و راغ گفتند اے بسیطِ زمیں باتو سازگار
مارا کہ راہ ازتنک آبی نہ بردہ ایم ازدستبرد ریگ بیاباں نگاہ دار"
واکردہ سینہ را بہ ہواہائے شرق و غرب دربر گرفتہ ہمسفرانِ زبون و زار

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
باصد ہزار گوہریک دانہ می رود

دریائے پرخروش از بندوشکن گذشت ازتنگنائے وادی وکوہ ودمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را ازکاخ شاہ وبارہ وکشت وچمن گذشت
بیتاب وتندوتیزوجگر سوزو بیقرار درہر زماں بتازہ رسیدازکہن گذشت

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

کتنا حسین اور دلکش ہے یہ منظوم ترجمہ۔ شاہاں بہ شاہاں می دہند اسی کو کہتے ہیں۔

طلوع اسلام اس سالِ نو کا آغاز اسی کہکشانی مقدس یادگار سے کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جو جی میں آئے کر دیکھے۔ اسے منزلِ مقصود تک صرف وہی راستہ پہنچا سکے گا جس پر محمدؐ رسول اللہ والذین معہ، کے نقوشِ قدم درخشندہ ستاروں کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں۔

منزل ملی۔ مقام مِلا۔ مدعا مِلا
سب کچھ مجھے مِلا جو ترا نقشِ پا مِلا

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان نقوش کو اپنے دامن میں اس طرح محفوظ کر رکھا ہے۔

(بحوالہ طلوع اسلام بابت جنوری ۱۹۵۷ء)

لمعات

خاتم النبیینؐ

جب آدم نے اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہی کچھ کیا جس سے اُسے منع کیا گیا تھا (۲/۳۵) تو وہ اس نافرمانی کی پاداش میں اُس مقامِ بلند سے گر گیا جس پر وہ شاداں و فرحاں سرفراز تھا۔ (۲/۳۶) اس ہبوط سے وحدتِ اشتراک کی زندگی ختم ہو گئی اور نوبت سر پھٹول، یعنی بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) تک آپہنچی۔ یہ دیکھ کر آدم کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ چاروں اطراف سے خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ اور اس کا کوئی یار و مددگار نہیں۔ وہ اس خوفِ تنہائی سے تھر تھر کانپتا رہا۔ آخر اپنے کیے پر پشیمان ہوا اور گڑگڑا کر عرض کرنے لگا اے بارِ الٰہا! میری بازآفرینی کی کوئی صورت ہے؟ آواز آئی کیوں نہیں! وہ صورت میں بتا دوں گا، پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہاری اس حالت کا ذمّہ دار کون ہے؟ آدم نے جواب دیا "اے ہمارے نشوونما دینے والے اس انحطاط اور محرومی کے ذمّہ دار ہم خود ہیں اور اگر اس وقت تیری طرف سے ہماری حفاظت اور مرحمت کا انتظام نہ ہوا تو ہم ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے (۷/۲۳)۔ ارشاد ہوا کہ ہلاکت اور بربادی سے مصئون رہنے کی ایک صورت ہو گی اور وہ یہ کہ زندگی ہمارے قوانین کے تابع بسر کی جائے۔ اس طرح اپنے آپکو اس مقامِ بلند کا اہل ثابت کر دو تو اُسے پھر سے حاصل کر سکو گے۔ اس کی عملی صورت یہ ہو گی کہ "میری طرف سے تمہارے پاس، میرے رسول ہدایت لے کر آئیں گے، جو تم ہی میں سے ہوں گے، اور پھر جو کوئی اس راہنمائی کا اتباع کرے گا اور اپنی اصلاح کریگا، وہ ہر خطرے سے محفوظ و مامون ہو جائیگا۔ اور اس طرح اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیگا (۲/۳۸، ۷/۳۵)۔ چنانچہ

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ (۲/۲۱۳)

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو اپنی وحی دے کر بھیجا۔ وہ لوگوں کو اختلافی زندگی کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوش گوار ثمرات کی خوش خبری سناتے۔ ہر نبی اپنے ساتھ قوانینِ خداوندی کا ضابطہ (الکتاب) لاتا جو حق پر مبنی ہوتا، تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی امور

کا فیصلہ کر دے، جو وجہ نزاع تھے۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور ایک وقت آیا کہ بنی نوع انسان کے لیے جتنی راہنمائی کی ضرورت تھی، وہ اپنی آخری اور مکمل شکل میں انسانوں تک پہنچ گئی۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (۶/۱۱۶)

قوانینِ خداوندی صدق و عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئے اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

اس میں ختم نبوت لازم آگئی۔ یعنی جب ضابطۂ خداوندی کی تکمیل ہو گئی اور اس کے بعد اس میں کسی تبدیلی کا امکان نہ رہا تو کسی نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اس طرح حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر "پیغمبری" کے تمام اسلوب ختم ہو گئے

دوسرے امور کے علاوہ، قرآن حکیم نے ختمی المرتبتؐ کی بعثت کی غایت یہ بتائی:۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ (۷/۱۵۷)

وہ نوعِ انسانی کے سر سے تمام بوجھ اتار کر رکھ دے گا، جس کے نیچے وہ دبی ہوئی چلی آرہی ہے اور ان تمام زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں وہ جکڑی ہوئی ہے۔

انسانیت پر اس احسانِ عظیم کے ساتھ ہی، اس سے یہ کہہ دیا گیا کہ:۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں — یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں (اقبالؒ)

محمدؐ سے وفا کا مطلب اُس پیغام سے وفا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاتم النّبیین کے ذریعے نوعِ انسانی کی راہنمائی کے لیے عطا ہوا تھا یعنی "قرآن کریم"

طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش — تازہ کن با مصطفےٰ پیمانِ خویش

بعثتِ رسالت مآب کی ایک اور عظیم غایت و مقصود کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے کہ:۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹/۳۳)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین الحق کے ساتھ بھیجا تاکہ اُسے کل ادیان پر غالب کرے خواہ اسے مشرکین برا ہی کیوں نہ مانیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ۝ (۳۳/۴۵-۴۷)

اے نبی ہم نے تجھے اس لیے بھیجا ہے کہ تو وحیِ خداوندی کے مطابق، ایسا نظام قائم کر دے جو

تمام انسانوں (اقوامِ عالم) کے اعمال کی نگرانی کرے (۲/۱۴۳) اور لوگوں کو بتا دے کہ اس کے مطابق چلنے کا انجام کیسا خوشگوار ہوگا، اور اس کی خلاف ورزی کے عواقب کس قدر تباہ کن ہوں گے۔

ہمارا یہ رسول، ہمارے ضابطہ کے مطابق نوعِ انسانی کو نظامِ خداوندی کی طرف دعوت دیتا ہے، اور انسانی زندگی کی تاریک راتوں میں، سورج کی طرح جگمگاتا ہے۔

اے رسول! تو اس ضابطۂ ہدایت پر ایمان رکھنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ انہیں خدا کی طرف سے بڑی خوش حالیاں اور فارغ البالیاں نصیب ہوں گی۔

ان وجوہات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی اطاعت کو خدا کی اطاعت قرار دیا کہ لوگ ان کی بات مان کر پیغامِ [redacted] کی طرف رجوع کریں اور اس پر عمل کریں۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴/۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی

اور رسول کی اطاعت کا طریقہ یہ بتایا گیا کہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴/۶۴)

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا سلسلہ ہدایت محض نظری عقائد اور رسومات کے لیے نہیں آتا نہ ہی خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلیم کا نام ہے کہ زبان سے خدا کا اقرار کر لیا اور جس طرح جی چاہا اپنے اپنے طور پر زندگی بسر کرتے رہے۔ دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے، جو سب سے پہلے، خود رسول کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے، اور اس میں، اس کی حیثیت مرکزی اتھارٹی کی ہوتی ہے۔ قانونِ خداوندی کے مطابق، اس کی اطاعت، خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔ اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے ذہن کے مطابق "خدا کی اطاعت" اطاعتِ خداوندی نہیں کہلا سکتی۔ اس اطاعت کی عملی شکل وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ قوانینِ خداوندی کے ساتھ، رسول کو بھیجا ہی اس لیے جاتا ہے۔

گویا رسول کی اطاعت کا مطلب پیغام (قانون) خداوندی کا اتباع ہے جس کے لانے کے لئے رسول مبعوث ہوتا ہے۔ اس طرح جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی (۴/۸۰)

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ خدا کی اطاعت، درحقیقت قوانینِ خداوندی (کتاب اللہ) کی ایسی اطاعت ہے، جو اُس رسول کی وساطت سے کی جائے جو اس قانون کو نافذ کرتا ہے۔ اس کو قرآن میں اللہ اور رسول کی اطاعت کہا گیا ہے۔ اگر اس سے خدا اور رسول کی الگ الگ اطاعتیں مراد لی جائیں تو یہ چیز خود قرآن کے اس واضح اصول کے خلاف چلی جائے گی کہ کسی بشر کو اس کا حق حاصل نہیں ہے، خواہ اُسے خدا نبوّت اور کتاب ہی کیوں نہ عطا کرے کہ وہ لوگوں

سے اپنی اطاعت کرائے ۳/۷۸

(قرآنی معاشرہ کے اندر رسول کی حیثیت مرکزی اتھارٹی کی ہوتی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ عدالت کے بارے میں ارشاد ہوا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵)

اے رسول! تم ان لوگوں کو ہماری طرف سے کہدو کہ خدا کا قانون اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے۔ جب تک یہ اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں حَکَم (فیصلہ کرنے والا ثالث) نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم صادر کرو اس کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم نہ کر دیں کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں (۴/۶۵) دل میں گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کرنے کا اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ فیصلہ کسی مستبد حاکم کا فیصلہ نہیں جسے طوعاً و کرہاً تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یہ فیصلہ اس قانون کا ہے، جس کی صداقت پر یہ، بہ طیبِ خاطر، ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اس ایمان کا فطری نتیجہ ہے کہ اس فیصلے کو دل کی رضامندی سے تسلیم کیا جائے۔ اگر اس کے خلاف دل میں کبیدگی پیدا ہو، تو یہ اس بات کی شہادت ہو گی کہ انہوں نے اس قانون کو بہ طیبِ خاطر قبول نہیں کیا تھا۔ ان کا اس پر ایمان نہیں تھا۔ رسول، قرآن کے مطابق ہی فیصلے کرتا ہے۔ اپنی طرف سے نہیں کرتا۔ رسول جو فیصلہ کرتا ہے قانونِ الٰہی کے مطابق کرتا ہے ارشادِ الٰہی ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵/۴۸)

لہٰذا اب جبکہ تمہارے پاس حق (قرآن) آ گیا تو تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے اس کتاب (قرآن) کے مطابق کرو لوگوں کے خیالات اور خواہشات کے پیچھے مت چلو اس سلسلے میں نبی اکرمؐ کے فیصلوں کا مدار قرآنِ حکیم کو ٹھہرایا گیا ہے لوگوں کے جذبات کو نہیں۔ یہ ہے مفہوم خدا اور رسول کی اطاعت کا۔

منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرمادیا:۔

اِتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ (۶/۱۰۶، ۳۳/۲)

اے رسول! تم اس ضابطۂ خداوندی کا اتباع کرو جو تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے وحی ہوا (یعنی قرآن)، اور خدا کے سوا کسی اور قانون کا اتباع مت کرو۔

اس پر حضورؐ نے اقرار کیا۔

اِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحٰى إِلَيَّ ۖ (۴۶/۹، ۶/۵۰)

میں اُسی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتا ہے (یعنی قرآن)

پھر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرمایا کہ اب لوگوں سے بھی کہہ دیجئے کہ :-

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ط (۷/۳)

تم اس کتاب کا اتباع کرو جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے اور اس کے سوا نہ تو کسی اور کو کارساز بنا ڈالو اور نہ سرپرست۔

ان تصریحات سے صاف ظاہر ہے کہ حضورؐ کی اطاعت سے مقصود اُن قوانین کا اتباع ہے۔ جن کا اتباع، حکم خداوندی کے مطابق سب سے پہلے خود حضورؐ نے کیا اور جن کے اتباع کا حکم لوگوں کو دیا۔ اس حقیقت کی تشریح اس طرح فرما دی گئی کہ

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲/۴۰)

(یاد رکھو) حکومت صرف اللہ کے لیے ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ یہی دینِ قیم ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

دوسری جگہ فرمایا :-

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)

خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا

مزید ارشاد ہوا۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۱۱۰)

جو آدمی لقاءِ رب کا متمنی ہے۔ اُسے چاہیئے کہ وہ نیک کام کرے اور خدا کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔

جیسا کہ آپ ذرا آگے چل کر دیکھیں گے کہ حضورؐ پر خدا کی طرف سے صرف قرآن ہی بذریعہ وحی نازل ہوا تھا (۶/۱۹) اس کی غائیت یہ تھی کہ حضورؐ اس کے ساتھ لوگوں کی راہنمائی فرمائیں (۱۸/۲۷ ، ۶/۱۵۵ ، ۳۳/۴۶) نظامِ حیات کی تعمیر فرمائیں (۵/۴۸) اور اسلامی تحریک کی قیادت فرمائیں (۴/۶۴ — ۶۵)۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مفکرِ اسلام ہونے کا دعوے بھی کرتے ہیں اور اقدارِ (حقائق) قرآنی کی تکذیب بھی کرتے ہیں۔ مثلاً ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ

"عام ناظرین کی تفہیم کے لیے عرض کرتا ہوں کہ دو باتوں کو اگر آدمی اچھی طرح جان لے تو اس کے

ذہن میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہو سکتی (وہ دو باتیں کون سی ہیں) ایک یہ کہ وحی کی دو بڑی قسمیں ہیں ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجی گئی تھی تاکہ آپ انہی الفاظ میں اسے خلق تک پہنچا دیں۔ اس کا نام "وحی متلو" ہے۔ اور اس نوعیت کی تمام وحیوں کو اُس کتابِ پاک میں جمع کر دیا گیا ہے جسے قرآن کے نام سے ساری دنیا جانتی ہے۔ دوسری قسم کی وحی وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہنمائی کے لیے نازل کی جاتی تھی تاکہ اس کی روشنی میں آپ خلق کی راہنمائی فرمائیں، اسلامی نظامِ حیات کی تعمیر فرمائیں اور اسلامی تحریک کی قیادت کے فرائض انجام دیں ..... یہی چیز ہے جسے سنّت بھی کہا جاتا ہے اور "وحی غیر متلو" بھی، وہ وحی جو تلاوت کے لیے نہیں"

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۹ - ۱۴۸ - ترجمان القرآن (منصبِ رسالت نمبر) بابت ستمبر ۱۹۶۱ء)

مودودی صاحب کے مندرجہ بالا بیان کے مطابق وحی کی کئی اقسام ہیں جن میں سے دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک "وحی متلو" جسے حضورؐ خلق تک پہنچائیں اور دوسری وحی "غیر متلو" جو نبی اکرمؐ کی راہنمائی کے لئے نازل کی جاتی تھی تاکہ اس کی روشنی میں آپ خلق کی راہنمائی فرمائیں۔ اسلامی نظامِ حیات کی تعمیر فرمائیں اور اسلامی تحریک کی قیادت کے فرائض سرانجام دیں ..... یہی چیز ہے جسے سنّت بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ وحی جو تلاوت کیلئے نہیں۔ اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن تلاوت کے لیے ہے اور "وحی غیر متلو" (سنّت) عمل کے لیے۔ اگر بقول مودودی صاحب صورت یہی ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے یہ اعلان کس سلسلہ میں کروایا کہ:-

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ۟ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ (۶/۱۹)

ان سے پوچھو کہ، ان حقائق کی صداقت کے لیے (جنہیں میں بیان کرتا ہوں) کس کی شہادت سب سے بڑی ہو سکتی ہے؟ میرے اور تمہارے درمیان خود خدا کی شہادت موجود ہے کہ یہ قرآن مجھے بذریعہ وحی اس لیے دیا گیا ہے کہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور انہیں بھی جن تک یہ بعد ازاں پہنچے، زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کروں (۱۸/۲۷)۔ یعنی تمہاری صحیح سمت کی طرف راہنمائی کروں۔ اس مقام پر اس بات کی بالصراحت وضاحت کر دی کہ حضورؐ جس وحی کے ذریعے لوگوں کی راہنمائی کرتے تھے ۲۱/۴۵ وہ قرآن ہی کے اندر ہے اس سے باہر کہیں نہیں۔

اس سلسلہ میں طلوع اسلام میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت اتنا ہی کہنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے کہ کیا یہی اسلوب ہیں پیام محمدؐ (قرآن) کے ساتھ وفا کے؟ کیا یہی قرینہ ہے خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ کی سنت کی پیروی کا؟ کیا

یہی احترام ہے رسالت مآب کے اسوۂ حسنہ کا؟

جیسا کہ سابقہ اوراق میں بیان کیا گیا ہے، وحیٔ رسالت نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گئی، دین مکمل ہو گیا اس طرح نوعِ انسان کی راہنمائی کے لیے جس قدر اصولی تعلیم کی ضرورت تھی اُسے مکمل شکل میں دے کر (قرآن کی دفتین میں) ہمیشہ کے لیے اس طرح محفوظ کر دیا گیا کہ اس میں ایک شعشہ تک کے برابر کہیں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ الفاظ کی ترتیب وہی، آیتوں کے الفاظ وہی، حتیٰ کہ پوری کی پوری کتاب بعینہٖ وہی ہے جو پیغمبر آخر الزمانؐ نے دنیا کو دی۔ وحیٔ قرطاس پر ہے تو وہی، جو قلوب میں ہے تو وہی۔ اس کیفیت کے بعد انسان کو کسی "آنے والے" کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ جسے آنا تھا وہ آخری بار ساری دنیا کے لیے "بشیر و نذیر" بن کر آ گیا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

"اس نقطۂ خیال سے دیکھئے تو پیغمبر اسلام دنیائے قدیم و جدید کے درمیان بطورِ حدِ فاصل کھڑے دکھائی دیں گے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپ کی وحی کا سرچشمہ کیا ہے تو آپ دنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر نظر کی جائے کہ آپ کی وحی کی روح کیا ہے تو آپ کی ذات گرامی دنیائے جدید سے متعلق نظر آئے گی۔ آپ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پا لیا جن کی اسے اپنی نئی شاہراہوں کیلئے ضرورت تھی۔ اسلام کا ظہور استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لیے عہد طفولیت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن کریم غور و فکر اور تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علم انسانی کے ذرائع ٹھہراتا ہے۔ یہ سب اس مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختم نبوّت کی تہہ میں پوشیدہ ہے۔"

انسانیت اپنے مالکِ حقیقی کے اس احسانِ عظیم کا حق کس طرح ادا کر سکتی ہے جس کے ذریعہ اُس نے حضور نبی اکرمؐ کو خاتم النبیینؐ کہنے کے ساتھ انسانیت کو یہ کہہ دیا کہ ہمارے اس پیامبر کے بعد کوئی انسان، قیامت تک، تمہیں یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میرے ذریعہ تمہارے خدا نے تمہیں یہ حکم دیا ہے۔ ہمیں جو ہدایت بھی تمہیں دینی تھی۔ اس آخری رسول کے ذریعہ دے دی۔

اس احسانِ عظیم کا حق اسی طرح ادا ہو سکتا ہے۔ کہ حضورؐ کے خاتم النبیینؐ ہونے کو قولاً ہی نہیں فعلاً بھی اپنایا جائے۔ جس کا التزامی پہلو یہ ہے کہ حضورؐ کے حجۃ الوداع کے موقع پر دیئے ہوئے اس ارشاد کے مطابق۔

انی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہ ان اعتصتم بہٖ کتاب اللہ

قرآن کریم کو اپنی حیاتِ ارضی میں قابلِ اعتماد رہبر سمجھ کر اس زندگی کے ہر گوشے کے لیے اسی سے راہنمائی حاصل کیجائے .... علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے کہ

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — این کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

براہِ کرم

احباب نوٹ فرمالیں کہ:

ادارہ طلوعِ اسلام کے نام صرف وہ رقوم ارسال کی جائیں جو ماہنامہ طلوعِ اسلام کا بدل اشتراک ہوں۔

اکاؤنٹ نمبر: 3972-54 حبیب بنک لمیٹڈ مین مارکیٹ برانچ گلبرگ لاہور

علاوہ ازیں تمام رقوم (بذریعہ چیک / ڈرافٹ)

بنام

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

اکاؤنٹ نمبر 4107-35 حبیب بنک لمیٹڈ مین مارکیٹ برانچ گلبرگ لاہور

بھیجی جائیں

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

میلادُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

شباب آلود ہونے کیلئے تھی مضطرب طفلی
ابھی دُنیائے بے ترتیب تھی محتاج زینت کی

ہر دیدۂ مُشتاق محرومِ تجلّی تھا
ابھی ناآشنائے ہوش ہر حرفِ تسلّی تھا

جہالت تھی کہیں اِنسانیت چاکِ گریباں تھی
جمالِ ذات کو منظور پھر تکمیلِ ایماں تھی

تصوّر میں ابھی یزداں کے اِک رنگیں نظارہ تھا
کہ رقصاں ذہن میں حسنِ کرم کے اِک شرارا تھا

یکایک بحرِ الطاف وکرم میں آئی طُغیانی
کہ لہراتی نظر آنے لگی پھر موجِ نورانی!

وہ لمحہ آگیا جس سے جہاں میں روشنی ہوگی
وہ لمحہ جلوہ گر جس میں تجمّل زندگی ہوگی!

بہارِ گلشنِ ایجاد کا وہ اوّلیں لمحہ
وہ چشمِ فکرِ یزداں کا تڑپتا سُرمگیں لمحہ

وہ لمحہ جس کو تھا احساسِ طفلی بزمِ دوراں میں
وہ لمحہ جو ابھی تک مضطرب تھا ذہنِ یزداں میں

وہ لمحہ جس میں تکمیلِ محبّت ہونے والی تھی
وہ لمحہ جس میں تشکیلِ محبّت ہونے والی تھی

وہ لمحہ جس میں انوارِ تجلّی جلوہ فرما تھے
وہ لمحہ جس میں اسرارِ تجلّی رقص فرما تھے

وہ لمحہ سرنگوں ظلمت کے پرچم ہوگئے جس میں
وہ لمحہ قیصر وکسریٰ کے سر خم ہوگئے جس میں

وہ لمحہ یعنی صد رشکِ تجلّی جس کے سائے ہیں!
جنابِ رحمۃ للعالمینؐ تشریف لائے ہیں!

(ڈاکٹر عارف بٹالوی)

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

قرآن کریم اور تاریخِ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ انسانیت کا خون چوسنے والے "تین اژدہے" رہے ہیں، ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت۔ تاریخ کے ہر دور میں، ان میں سے کوئی نہ کوئی، انسانیت پر عرصۂ حیات تنگ کرتا رہا ہے اور قرآنِ کریم کی شہادت کے مطابق تاریخ کا ایک دور ایسا بھی آیا جب یہ **تینوں** بیک وقت اپنی شکار قوم (قومِ بنی اسرائیل) کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کے لیے ایک دوسرے کے دست و بازو بنے۔ فرعون، ملوکیت کا۔ قارون، سرمایہ داری کا اور ہامان، مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ۔ جن کی وحشت سامانیوں کے سامنے تڑپتی، بلبلاتی قومِ بنی اسرائیل۔ کو ان کے پنجہ ہائے استبداد سے نجات دلانے کے لیے صاحبِ ضربِ کلیمؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر کو بھیجا گیا۔

اقبالؒ نے ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کو انہی درندوں سے محفوظ کرنے کے لیے تصوّرِ پاکستان دیا اور بابائے قوم حضرت قائدِاعظمؒ نے اُن کے عطا فرمودہ تصوّر کی بنیادوں پر، اپنی جان پر کھیل کر، ہمارے لیے پاکستان حاصل کیا۔

لیکن وائے قسمت! کہ اُسی پاکستان میں ـــــ جسے ہمارے ان ابطالِ ملّت نے اِن جذاموں، سے پاک کرنے کے لیے حاصل کیا تھا ـــــ یہ اکاس بیل کی طرح، جسدِ ملّتِ پاکستانیہ کے گرد اپنی گرفت کو مضبوط تر کئے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں زندگی کے ہر شعبہ پر (مسانیدِ حکومت سمیت) ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت جس تیزی اور شدّت سے چھائے جا رہے ہیں، اس سے اُن مقاصد کا حصول جن کے لیے، پاکستان بنایا گیا تھا، اسی تیزی سے بعید تر ہوتا جا رہا ہے۔

آجکل حیاتِ پاکستان کے ہر گوشہ سے مذہبی پیشوائیت کی بالعموم اور **تصوّف** کی بالخصوص آبیاری کی جا رہی ہے۔ (صدرِ مملکت، وزیرِاعظم اور وزرائے اعلیٰ ان کی آراستہ کی ہوئی محفلوں میں جانا باعثِ سعادت سمجھتے ہیں)، اُس تصوّف کی جس کے متعلّق خالقِ تصوّرِ پاکستان، اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

"اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوّف کا وجود ہی سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے۔ جس نے عجمیوں کی دماغی

آب وہوا میں پرورش پائی ہے"۔

(سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام خط مورخہ ۱۳ ؍ نومبر ۱۹۱۷ء
بحوالہ تصوف کی حقیقت از محترم غلام احمد پرویزؒ صہ ۲۸۰)

ہم اس پاکستانی کی خدمت میں، جس کے دل میں پاکستان کی بقا، سلامتی اور خوشحالی کے لیے ذراسا بھی درد ہے، حضرت علامہ اقبالؒ کا وہ مقالہ پیش کرتے ہیں، جسے انہوں نے لکھنؤ سے شائع ہونیوالے اخبار NEW ERA کی اشاعت بابت ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء میں ISLAM AND MYSTICISM کے عنوان سے شائع کیا تھا اور جو تصوف کو غارت گرِ دین و دُنیا ثابت کرنے میں قولِ فیصل کا درجہ رکھتا ہے۔ اس مقالہ کا اُردو ترجمہ (مجلّہ اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۸ء کے شکریہ کے ساتھ) بحوالہ "تصوف کی حقیقت" درج ذیل کیا جاتا ہے۔ چونکہ آجکل حکومت اور عوام کی ہر سطح سے تعلیماتِ اقبالؒ کو بڑھ چڑھ کر پیش کیا جارہا ہے۔ اس لئے ہم نے بھی، اپنی بات کو، اقبالؒ ہی کے حوالہ سے کہنا زیادہ مناسب جانا ہے۔ اب آپ وہ مقالہ دیکھئے۔

طلوع اسلام

اس مقالہ کا عنوان ہے۔

تصوّف ــــ شعبدہ بازوں کی کمند

"آج کل کا مسلمان یونانی وایرانی تصوّف کی ان تاریک وادیوں میں بے مقصد و مدعا ٹامک ٹوئیے مارتے پھرنے کو ترجیح دیتا ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ گردوپیش کے حقائقِ ثابتہ سے آنکھیں بند کر لی جائیں، اور توجہ اس نیلی، پیلی اور سُرخ روشنی پر جما دی جائے جسے "اشراق" کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت دماغ کے ان خانوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے جو ریاضت کی کثرت و تواتر کے باعث ماؤف ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خودساختہ تصوّف اور یہ "فنائیت"، یعنی حقیقت کو ایسے مقام پر تلاش کرنا جہاں اس کا وجود ہی نہ ہو، دراصل ایک بدیہی علامت ہے جس سے عالم اسلام کے روبہ انحطاط ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

دنیائے قدیم کی تاریخِ ذہنی کے مطالعے سے یہ نہایت اہم حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ زوال پذیر قوموں اور گروہوں نے ہر دور میں اس خودساختہ تصوّف اور فنائیت کے اوٹ میں پناہ لی ہے۔ جب روحِ حیات فنا ہو جاتی ہے اور زمان و مکان کے مسائل سے دست وگریباں ہونے کی ہمت باقی نہیں رہتی تو داعیانِ انحطاط ایک مزعومہ ولایت و سرمدیت کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح اپنے معاشرے کی روحانی بے مائیگی اور جسمانی فرسودگی کو آخری مرحلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ بظاہر ایک لُبھا لینے والا نصب العین وضع کر لیتے ہیں جس کے فریب

میں مبتلا ہو کر صحت مند اور قوی افراد بھی رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کا نظام ایک خاص نوعیت کا ہے جسے اوہام و وساوس کے ان ماتوں نے شدید نقصان پہنچایا ہے۔ بحیثیت ایک معاشرے کے، ہماری تخلیق اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اجتماعی ترتیب و تنظیم میں نسل و زبان کے امتیازات پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا جائے۔ یہ مقصد اسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس نظامِ شریعت کے تابع رکھیں جو اصلاً الہامی مانا جاتا ہے لیکن قدیم صوفیہ کا عقیدہ یہ تھا کہ شریعت کی حیثیت تو محض ایک مظہر کی تھی اور وہ خفیہ خفیہ اس کی تلقین بھی کرتے رہے یعنی کہتے رہے کہ یہ حقیقت کا ایک قشر اور ایک پردہ ہے اور حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ شریعت سے الگ ہے۔ اکثر حالتوں میں شریعت کی پابندی قائم رکھی گئی تھی کہ اجتماعی نفرین سے بچے رہیں، اگرچہ اس کی حیثیت ایک پردے ہی کی رہی۔ اسلامی فکر و ادب کا مطالعہ کرنے والا کوئی فرد اس اعتراف میں متأمل نہ ہو گا کہ شریعت سے اعراض کا رجحان اسی جھوٹے تصوّف کا براہِ راست نتیجہ ہے جو عجمی دل و دماغ کی پیداوار ہے حالانکہ شریعت ہی اسلامی معاشرے کو منظم و مرتبط رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔

یوں اسلامی جمہوریت رفتہ رفتہ اپنے اصل مقام سے ہٹتی گئی اور اسے ایک نوع کی روحانی امرائیت کا غلام بنا دیا گیا۔ یہ امرائیت ایسے علم و قوت کی مدعی تھی جس کے دروازے عام مسلمانوں پر بند تھے ... ...
مسلمانانِ اندلس ارسطاطالیسی روحیت سے آگاہی کے باعث مغربی اور وسطی ایشیا کے ضعف انگیز اثراتِ فکر کے دائرے سے باہر تھے۔ وہ ایشیا کی مسلم قوموں کے مقابلے میں روحِ اسلام سے قریب تر تھے۔ آخر الذکر قوموں نے عربی اسلام کو عجمی تخیلات میں ڈھلنے دیا، یہاں تک کہ وہ اپنی حقیقی و اصلی حیثیت سے بالکل محروم ہو گیا۔ تسخیرِ ایران کا نتیجہ یہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا، بلکہ یہ نکلا کہ اسلام ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔

مغربی اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ دسویں صدی عیسوی کے بعد سے کیجئے، جو کچھ میں اوپر لکھ چکا ہوں، اس کے ایک ایک حرف کی تصدیق و توثیق ملے گی۔ انحطاط کے سحر کی کیفیت یہی ہے کہ جن ہاتھوں سے ہم زہر کا پیالہ پیتے ہیں، انہی کو چومتے ہیں۔

واضح رہے کہ اسلام کا آفتاب تاریخ کے روزِ روشن میں افق پر جلوہ گر ہوا۔ ہمارے جمہوریت پرور پیغمبرِ اعظمؐ نے عاقل و دانشمند اصحابؓ میں زندگی بسر کی اور انہی میں کام کرتے رہے۔ ان اصحابؓ نے ایک ایک لفظ آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا جو اس پیغمبرِ اعظمؐ کی مقدس و بابرکت زبان پر جاری ہوا، حضورؐ کی تعلیمات میں کوئی بھی چیز نہیں جسے مخفی کہا جا سکے۔ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ زندگی کی مسرت اور روشنی سے لبریز ہے۔ یہ تاریک اور قنوطیت افزا تصوّف کے لیے وجہ جواز مہیا کرنے ہی سے پاک و مبرا نہیں بلکہ ان تمام مذہبی تعلیمات کے خلاف کھلا ہوا جارحانہ اقدام ہے جنہوں نے صدیوں تک عالمِ انسانیت کو مبتلائے فریب رکھا۔

پھر آیئے! دنیا کے حقائق کو خوشی خوشی قبول کیجئے۔ خدا اور اس کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جلال و عظمت کی خاطر ان حقائق سے عہدہ برآ ہونے کی سعی و کوشش میں مصروف ہو جایئے۔ اس شخص کی بات پر کان نہ دھریئے جو کہتا ہے کہ اسلام میں کوئی مخفی اصول بھی ہے جسے ناشناساؤں پر منکشف نہیں کیا جا سکتا۔ اسی پر جھوٹے مدعیوں کے اقتدار اور آپ کی غلامی کا انحصار ہے۔

دیکھئے، کس طرح رومی مسیحیت کی روح نے اپنے گرد و پیش مستحکم حصار تعمیر کر لئے تاکہ اس کی تاریک مملکتیں تاریخ نگاروں کے ممکن حملوں سے محفوظ رہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے تاریخ اسلام سے آپ کی ناواقفیت کی بناء پر فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو غلام بنا رکھا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ تاریخ کی روشنی کبھی نہ کبھی اس کی تعلیمات کے دھندلکے کو آپ کی ذہنی فضا سے زائل کر دے گی۔ لہٰذا، وہ آپ کو سکھاتے ہیں کہ حسّی ادراک، حجاب اکبر، ہے (العلم حجاب الاکبر) حسّی ادراک کے یہ دشمن آپ کے احساسِ حقائق کو کند کرتے ہیں اور علمِ تاریخ کی ——— بنیادیں کھوکھلی کر دیتے ہیں۔

نوجوان مسلمانو! اس شعبدہ بازی سے خبردار رہو۔ شعبدہ بازوں کی کمند بڑی مدت سے تمہاری گردنوں پر پڑی ہوئی ہے۔ دنیائے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے غیر مصلحانہ انداز کی اس توحید کو اپنا لیا جائے جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔ عجمیت کے دھندلکے سے باہر نکلو اور عرب کے درخشاں صحرا کی روشن فضا میں آجاؤ۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ کہ اقبال نے جس خطرہ سے قوم کو ۱۹۱۷ء میں خبردار کیا تھا۔ وہ کس کامیابی سے ہمیں چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی آخری کتاب ارمغانِ حجاز (جو اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی) میں ایک نظم لکھی ہے۔ جو بلاشبہ اُن کے زندگی بھر کے تجربات کی نچوڑ اور ان کی فکر کی معراج ہے۔ انہوں نے اس کا عنوان باندھا ہے:۔

ابلیس کی مجلس شوریٰ

ہم اس نظم کا وہ حصہ جس میں ابلیس اپنے مشیروں کو "شرعِ پیغمبرؐ کو آشکارا ہونے سے روکنے کے لیے اور اپنی ابلیسی سلطنت کی بقا کے لیے" وہ منشور دیتا ہے۔ جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ بایں

غرض شائع کر رہے ہیں کہ آپ دیکھ سکیں کہ آجکل اس کی ایک ایک شق پر کس وفاداری سے عمل ہو رہا ہے۔

بات کچھ یوں چلی آرہی ہے کہ ابلیس کے مشیر اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ابلیس کو ان خطروں سے آگاہ کرتے ہیں جن کی وجہ سے:۔

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

اور ابلیس اپنے تمام مشیروں کی رپورٹیں سننے کے بعد اُن کے سامنے لائحہ عمل رکھتا ہے۔ وہ نہایت اطمینان سے کہتا ہے کہ۔

ابلیس

(اپنے مشیروں سے)

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں، کیا مہر و مہ، کیا آسمانِ تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُو!
کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مُزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہُو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمّت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

☼

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآن نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فُغفُورِ و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتابُ اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

☼

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات؟

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات!

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

آخری شعر کو بار بار پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ ابلیسی حربے کس حد تک کارگر ہیں۔

یاد رکھئے اگر یہ قوم اپنے پروردگار کے دیئے ہوئے نظامِ حیات پر چلنا چاہتی ہے (اور اقوامِ عالم میں سرفرازی حاصل کرنے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں ہے) تو اُسے خالقِ کائنات کے اس ارشاد کو صدقِ دل سے اپنانا ہوگا۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۳/۱۹

اور دینِ اسلام پر (مذہبِ اسلام نہیں) عمل پیرا ہوا نہیں جا سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی اُس آخری کتاب کو اپنا رہنما نہ بنایا جائے جسے اس کے نازل کرنے والے نے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ضابطۂ حیات کہا ہے۔

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتابُ اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

☼

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات؟

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہیں مات!

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوّف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات!

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

آخری شعر کو بار بار پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ ابلیسی حربے کس حد تک کارگر ہیں۔

یاد رکھئے اگر یہ قوم اپنے پروردگار کے دیئے ہوئے نظامِ حیات پر چلنا چاہتی ہے (اور اقوامِ عالم میں سرفرازی حاصل کرنے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں ہے) تو اُسے خالقِ کائنات کے اس ارشاد کو صدقِ دل سے اپنانا ہوگا۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۳/۱۹

اور دینِ اسلام پر (مذہب اسلام نہیں) عمل پیرا ہوا نہیں جا سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی اُس آخری کتاب کو اپنا رہنما نہ بنایا جائے، جسے اس کے نازل کرنے والے نے مکمل، غیر متبدّل اور محفوظ ضابطۂ حیات کہا ہے۔

دین کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے؟

اس طرح کہ:

(۱) ایک آزاد مملکت اس امر کا اعلان کرے کہ اس کا تمام کاروبار، قرآنِ کریم کے مطابق ہوگا۔

(۲) قرآنِ کریم میں کچھ احکام و قوانین، متعین شکل میں دیئے گئے ہیں اور بعض اقدار، اصول کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کے احکام و قوانین ہوں یا اصول و اقدار سب غیر متبدل ہیں اور تمام مسلمانوں پر ہمیشہ کے لیے نافذ العمل رہنے کے لیے دی گئی ہیں۔

(۳) جن اقدار کے صرف اصول دیئے گئے ہیں، مملکت کے اربابِ فکر و نظر ——— نمائندگانِ ملت۔ ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ان کے جزئی قوانین مرتب کریں گے۔ ایسا کرنے میں وہ احادیث، تاریخ، فقہ کو اپنے سامنے رکھیں گے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق قوانین مرتب کریں گے جو کچھ پیچھے سے چلا آرہا ہے۔ اس میں جو قوانین ایسے ہوں گے جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہیں، اور جو ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں انہیں ویسے ہی رہنے دیا جائے گا جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی، ان میں تبدیلی کر لی جائے گی۔ جہاں نئے قانون کی ضرورت ہو، نیا قانون بنا لیا جائے گا۔ اس طرح قرآن کے اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں گے۔ یوں مستقل اور قابلِ تغیر و تبدل عناصر کے حسین امتزاج سے، کاروانِ ملت آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

(۴) دین کا مقصد، انسان کے، اس دنیا کے معاملات کو اس طرح حل کرنا ہے کہ اس سے وہ فساد (ناہمواری) ختم ہو جائے جس کی وجہ سے افراد اور اقوام اس بُری طرح جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں اور اس کے ساتھ ہی افراد کی ذات کی نشو و نما اس طرح ہوتی جائے کہ وہ موت کے بعد بھی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ **اگر ہمارا نظام اس قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے تو وہ صحیح اسلامی ہے۔** اگر اس سے یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں کہیں خرابی ہے۔ اس خرابی (یا خرابیوں)

کا سراغ ہمیں قرآنِ کریم کی روشنی میں مل سکتا ہے۔ میری حقیر کوششوں سے مقصود یہ ہے کہ ہم ان خرابیوں کا ازالہ کرکے، دین کے نظام کو انہی خطوط پر متشکل کر سکیں جن پر یہ حضور رسالتمآبؐ کے عہدِ مبارک میں استوار ہوا تھا۔

اس کے ساتھ اتنا اور سمجھ لینا چاہیئے کہ جب تک وہ نظام قائم نہ ہو (جسے خلافت علی منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے) اُس وقت تک اُمت جس جس طریق سے اسلام کے ارکان کو ادا کرتی چلی آرہی ہے، اس میں نہ کوئی تبدیلی کی جائے اور نہ ہی کوئی نیا طریقہ وضع کیا جائے۔ اس سے خواہ مخواہ مزید اختلاف اور انتشار پیدا ہوگا۔ البتہ جو نظریات و تصورات یا رسوم اور رواج قرآن کے خلاف رائج ہیں۔ ان کی بابت یہ بتایا جائے کہ یہ قرآن کے خلاف ہیں اور قرآنی نظام کی صحیح شکل کو اُجاگر کرکے اُمت کو اس طرف آنے کی دعوت دی جائے۔ جب وہ نظام قائم ہو جائے گا تو یہ اس کا فریضہ ہوگا کہ دیکھے اور فیصلہ کرے کہ مسلمانوں کے موجودہ اختلافات کو مٹا کر ان میں پھر سے وہ وحدتِ فکر و عمل کیسے پیدا کی جائے جو عہدِ رسالتمآبؐ میں وجہ بالیدگیٔ ملت تھی۔ میری کوشش بس اتنی ہے۔

پرویز

(ماخوذ از اسبابِ زوالِ اُمت ایڈیشن ششم صفحہ ۱۵۹ تا ۱۶۱)

بقیہ: کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

(صفحہ نمبر ۵۶ سے مسلسل)

کہیں خدا اور رسولوں پر ایمان کا ذکر ہے فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ (۳/۱۷۹) (پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ)۔ کہیں ان کے ساتھ ایمان بالکتاب کا بھی ذکر ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ النُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا (۶۴/۸) (پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا)۔

غرضیکہ مختلف مقامات پر مختلف اجزائے ایمان کا ذکر آتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ ایمان کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ کئے جا سکتے ہیں اور صرف ایک یا دو اجزاء پر ایمان لے آنا مومن ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مطالبہ تمام اجزائے ایمانیہ کا مشترک ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ شقِ اول ہے۔

(باقی آئندہ)

حُسنِ تحریر

قارئینِ کرام، سلام و رحمت!

اس سے پیشتر ہم آپکی خدمت میں، محترم پرویزؒ صاحب کی مایہ ناز تصنیف "معراجِ انسانیت" سے "فتح مکہ" اور "جنگ حنین" کی مناظر کشی پیش کر چکے ہیں۔

اس دفعہ ہم آپ کے سامنے سب سے پہلا معرکۂ حق و باطل یعنی "جنگِ بدر" لا رہے ہیں جہاں سے حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے سلسلۂ غزوات کہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے عشق کے دردمند کا طرزِ بیاں!

محمد عمر دراز

سلسلۂ غزوات

زندگی نام ہے جہدِ مسلسل اور سعیِ پیہم کا۔ جب یہ جہد و کاوش، حق کی حمایت کے لئے کی جائے تو اسے قرآن کریم کی اصطلاح میں جہاد کہا جاتا ہے۔ اس میں مستقل اقدارِ خداوندی کے عام کرنے اور انہیں ایک زندہ حقیقت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے کے سلسلہ میں ہر قسم کی کوشش شامل ہے۔ اسی کوشش میں ایک مقام ایسا بھی آجاتا ہے جب حق کی مدافعت میں، سر بکف اور شمشیر بدست میدانِ جنگ میں نکلنا پڑتا ہے۔ اسے قتال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے تصادم کو غزوہ کہتے ہیں۔ اب ہم، نبی اکرمؐ کے سفرِ حیات کی اس منزل میں آتے ہیں جہاں آپؐ کو حق کی مدافعت کے لیے، غزوات سے واسطہ پڑا۔

جنگ بدر

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرمؐ کی ہجرت، قریشِ مکہ پر کس قدر گراں گذری تھی۔ اس سے ان کے تمام عزائم خاک میں مل گئے، لیکن عرب کا جوشِ انتقام، اور وہ بھی اس قسم کی اجتماعی حیثیت لئے ہوئے، ایسا نہ تھا کہ یونہی ٹھنڈا پڑ جاتا۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ مسلمانوں کا تعاقب کیا جائے اور جب تک ان کی تحریک (اسلام) کا استیصال نہ کر لیا جائے چین سے نہ بیٹھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس خیال کو عام کیا،

اور اس طرح سارے عرب کو مخالفت و مبارزت کے لئے مشتعل کر دیا۔ ہجرت سے پہلے عبداللہ بن ابی وہاں کا رئیس تھا۔ قریش نے اسے خط لکھا کہ۔

تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ انہیں قتل کر ڈالو، یا مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کر دیں گے۔ اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کر لیں گے۔ (بحوالہ سنن ابی داؤد)

نبی اکرمؐ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے عبداللہ بن ابی کو سمجھایا کہ اس مخالفت میں تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے، اس لئے کہ انصار مسلمان ہو چکے تھے اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس نے قریش کی بات نہ مانی۔ قریش نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۲ھ ہجری کے اوائل میں مکہ کے ایک رئیس کرز جابر بن فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور مسلمانوں کے مویشی لوٹ کر لے گیا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب قریش کا قافلہ شام کی طرف تجارت کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس قافلہ کو واپسی پر اسی راستہ سے گذرنا تھا۔ امیرِ کارواں، ابوسفیان کو کسی نے یہ غلط خبر پہنچا دی کہ مسلمان تمہارے قافلہ کو لوٹنے کی فکر میں ہیں۔ اس نے اس کی اطلاع قریش مکہ کو بھیج دی۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ نخوتِ بدر ابہانۂ بسیار۔ ایک لشکرِ جرار ساتھ لے کر مدینہ کی طرف اُمنڈ آئے۔ نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا تو آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ ان کی بے سروسامانی کا جو عالم تھا وہ ظاہر ہے لیکن یہ تو قدوسیوں کی وہ جماعت تھی جس نے اپنی جان، اور مال حق کی حمایت کے لیے وقف کر رکھے تھے۔ وہ ہر حکم کی تعمیل کے لیے حاضر تھے۔ آپ نے انصار کی طرف نگاہ اٹھائی تو ان کے رئیس، سعد بن معاذؓ نے کہا کہ آپ حکم دیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔ چنانچہ آپ فدائیوں کی اس مختصر سی جماعت کو لے کر غنیم کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت خدا کی اس وسیع و عریض زمین میں خدا کا نام لینے والوں کی کل کائنات یہی تین سو کے قریب جاں نثار تھے جو لوائے حق و صداقت کے سائے میں اپنے دعوئے ایمان کی شہادت کے لئے اس طرح چل دیئے تھے۔ شوقِ شہادت کے دنور کا یہ عالم تھا کہ جب ایک کم عمر بچے (عمیر بن ابی وقاصؓ) سے کہا گیا کہ وہ واپس جا جائے تو وہ رو پڑا۔ اور حضورؐ کو مجبوراً اجازت دینی پڑی کہ وہ ساتھ ہو لے۔ اس جوشِ مسرت میں اس کا بڑا بھائی (سعد بن ابی وقاصؓ) اٹھا، اور چھوٹے بھائی کے گلے میں خود تلوار حمائل کی۔ آسمان کے فرشتے اس حسین منظر کو دیکھ رہے تھے اور خدائے علیم و خبیر سے عرض کر رہے تھے کہ بارالٰہا! آپ نے سچ کہا تھا کہ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ جان نثاروں کی یہ کل جماعت (۳۱۳) نفوس پر مشتمل تھی اور بے سروسامانی کا یہ عالم کہ ان کے ساتھ کل دو گھوڑے تھے۔ مقابلہ میں قریش بڑے کروفر اور شان و شوکت سے نکلے تھے، ہزار سپاہیوں کی جمعیت، سو سواروں کا رسالہ، تمام روسائے قریش (باستثنائے ابولہب) شریکِ فوج، رسد کا یہ انتظام

کہ دس دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ قریش کو بدر کے قریب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے باہر نکل گیا ہے، اور اب اندیشہ کی کوئی بات نہیں لیکن ان کی تو نیت ہی جنگ کی تھی۔ وہ واپس کیوں لوٹتے؟ وادی کے دوسری طرف نبی اکرمؐ نے ڈیرا ڈال دیا۔ حبابؓ بن منذر ایک صحابی تھے، انہوں نے خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ محلِ فروکشی کا یہ انتخاب وحی کی رو سے ہوا ہے یا حضورؐ نے اپنی رائے سے ایسا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وحی کا حکم نہیں۔ اس پر حبابؓ بن منذر نے عرض کیا کہ پھر اس مقام سے فلاں مقام زیادہ مناسب ہے، ہمیں وہاں جا کر اترنا چاہیئے۔ حضورؐ نے معاملہ کے ان تمام پہلوؤں پر غور کیا جو حضرت حبابؓ نے پیش کئے تھے، اور فرمایا کہ حبابؓ کی رائے زیادہ صائب ہے۔ چنانچہ آپ نے اسی رائے پر عمل فرمایا۔ رات کو بارش ہوئی تو موقع کے حسنِ انتخاب نے میدان کا نقشہ الٹ دیا۔ اب جو دیکھا تو بساطِ جنگ کا ہر گوشہ مجاہدین کے حق میں تھا۔ یہ

پہلا رمضان

اس رمضان کی سترہ تاریخ تھی جس میں پہلے پہل روزے فرض ہوئے تھے۔ دشمن کے مقابلہ کے لئے تو سترہ روزے ہی کافی ہیں، بشرطیکہ روزے سے مفہوم محض نان و آب سے اجتناب نہ ہو بلکہ نگاہ اس کے اس مفہوم پر ہو جو آب و گل کے پیکروں میں بجلیوں کی تڑپ پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں تو، سترہ رمضان، ۲ھ ہجری (مطابق ۱۳ مارچ ۶۲۴ء) کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں اور دنیا میں اس حقیقت کبریٰ کا اعلان کر رہی تھیں کہ انسانی تقسیم (قومیت) کا صحیح معیار کیا ہے؟ حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک کے حضرات انبیائے کرامؑ کے کوائف و احوال پر ایک نگاہ ڈالئے آپ کو نظر آجائے گا کہ کس طرح کفر و ایمان نے باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی، میاں اور بیوی، خویش و اقارب میں ایک بدیہی تفریق کر کے رکھ دی تھی۔ وہ واقعات فرداً فرداً تاریخ کے صفحات پر رونما ہوئے۔ لیکن آج وہ تمام کے تمام ان دو صفوں میں سمٹ کر سامنے آگئے۔ یہ دو صفیں جو ایک دوسرے کے مقابل شمشیر بکف کھڑی تھیں، کن افراد پر مشتمل تھیں؟ اُن پر جن کا ملک ایک تھا، زبان ایک تھی، رنگ و نسل ایک تھا، حسب و نسب ایک تھا، لیکن اس کے باوجود ایک وجہِ افتراق تھی جس نے ان تمام وجوہِ جامعیت کو منسوخ کر کے انہیں ایک دوسرے کے مدِمقابل کھڑا کر دیا تھا اور اس طرح دنیا کو بتلا دیا تھا کہ قرآن کی رُو سے قوموں کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ وہ وجہِ تفریق و علتِ تقسیم تھی ایمان! ایک طرف حضرت ابوبکرؓ تھے تو دوسری طرف مقابلہ میں ان کا بیٹا۔ ادھر حضرت حذیفہؓ تھے، تو صفِ غنیم میں ان کا باپ عتبہ۔ ادھر حضرت عمرؓ تھے تو ادھر آپ کا ماموں جس کے خون سے

انسانی تقسیم کا فطری معیار

آپ کی تلوار رنگین تھی۔ ادھر حضرت علیؓ تھے تو مخالف صف میں ان کے بھائی عقیل۔ نہیں! اور آگے بڑھیئے۔ ادھر خود محمدؐ تھے تو سامنے کی صف میں آپ کے حقیقی چچا (حضرت) عباس، اور آپ کے داماد ابوالعاص! ادھر اُم المومنین حضرت سودہؓ تھیں تو سامنے ان کے عزیز سہیل بن عمرو۔ یہ تھی وہ حقیقی تقسیم جو وطن، رنگ، زبان، نسل کے غیر فطری

حدود و ثغور سے ماورا تھی۔ حبش کا رہنے والا بلالؓ اپنوں میں سے تھا، لیکن حقیقی چچا عباس غیروں میں سے۔ روم کا صہیب یگانہ تھا لیکن حقیقی بیٹا بیگانہ۔ صفیں کھڑی ہوئیں تو امام جماعت (حضور نبی اکرمؐ) نے ان پر تیرتی ہوئی نگاہ ڈالی اور ایک تیر کے اشارے سے صفیں سیدھی کیں۔ (یہ جو آپ نماز باجماعت کے وقت "صفیں سیدھی کرلو" کی تاکید سنا کرتے ہیں، یہ اسی زندگی بخش، اور حیات آفریں "سُنّت کی پیروی" ہے۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

عین اس وقت حذیفہؓ بن الیمان اور ابو حسیلؓ دو صحابی دوڑتے دوڑتے، صفوں میں شامل ہوئے۔ یہ کہیں دوسری طرف سے آرہے تھے۔ ایسے موقع پر لشکر میں ایک آدمی کا اضافہ بھی ہزار مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ مجاہدین کو بڑی خوشی ہوئی۔ حضورؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ وہ کسی اور طرف سے آرہے تھے۔ راستہ میں کفار نے روکا کہ تم محمدؐ کی مدد کو جارہے ہو۔ انہوں نے انکار کیا، اور وعدہ کیا کہ وہ اس جہاد میں شرکت نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ مجاہدین سے آکر ملے ہیں۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا کہ تم نے ان سے عدم شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے۔ فکر نہ کرو، ہماری مدد اللہ کرے گا۔

ایفائے عہد کا عدیم النظیر واقعہ

غور فرمائیے! بلندیِ کردار اور حسنِ سیرت کی اس قدر تابندہ مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟

اب اس معرکۂ حق و باطل کی مزید تفصیلات قرآن کے الفاظ میں سنیئے۔ چونکہ خیر و شر کی آویزش میں یہ جنگ بڑی اساسی اہمیت رکھتی ہے اس لئے قرآن کریم نے شرح و بسط سے اس کا تذکرہ کیا ہے اور پوری کی پوری سورۂ انفال گویا اس کے کوائف و عواطف پر مشتمل ہے۔ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ مدینہ میں یہ اطلاع آچکی تھی کہ ایک طرف سے قریش کا قافلہ آرہا ہے اور دوسری طرف سے انکا لشکرِ جرار۔ اب فطری طور پر بعض لوگوں کا رجحانِ طبیعت اس طرف ہوگا کہ اگر مقابلہ ہونا ہے تو قافلہ والوں کے ساتھ ہو کیونکہ اس بے سروسامانی کے عالم میں جو اس وقت مدینہ کے مسلمانوں پر مسلّط تھی، قریش کے جنود و عساکر کا مقابلہ مشکل نظر آتا تھا۔ لیکن دین کا تقاضا تھا کہ حق و باطل کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہو جائے اور روسائے قریش اپنی قوت کے زعمِ باطل پر جو اس قدر حق کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں انہیں معلوم ہو جائے کہ حق کی اس آواز کو دبا لینا آسان نہیں۔ چنانچہ یہ تھا وہ فیصلہ جس کے ماتحت مجاہدین کی یہ بے سروسامان جماعت گھر سے نکلی۔

قرآنی تفاصیل

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

كَرِهُوْنَ ۝ ..... لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

(۸/۵-۸)

(اس معاملہ میں بھی ویسا ہی سمجھو) جس طرح (جنگ بدر میں) یہ بات ہوئی تھی کہ تو اپنے پروردگار کے پروگرام کے مطابق حق کے ساتھ مدینہ سے باہر نکلا تھا۔ حالانکہ تمہاری جماعت میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جس پر یہ فیصلہ ناگوار گذرا تھا۔ وہ تجھ سے اس باب میں جھگڑتے تھے حالانکہ معاملہ واضح ہو چکا تھا۔ (وہ باہر نکل کر مقابلہ کرنے سے اس درجہ ناخوش تھے) گویا انہیں زبردستی موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے اور وہ (اپنی موت اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہیں۔ پھر جب تم آگے بڑھے تو حالات بتا رہے تھے کہ خدا کے اس وعدے کے مطابق جو اس نے ایمان و اعمالِ صالحہ کے بدلے میں استخلاف فی الارض کے متعلق کر رکھا ہے، تم مقابل کے دو گروہوں میں سے ایک پر ضرور غالب آجاؤ گے (اس گروہ کی جو جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا) یہ خواہش تھی کہ مقابلہ اس گروہ کے ساتھ ہو جو مسلح نہیں تھا اس لئے لڑائی کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن خدا کے قانونِ مشیت کا تقاضا یہ تھا کہ تمہارا مقابلہ ان کے لشکر سے ہو تاکہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ حق باطل پر کس طرح غالب آیا کرتا ہے اور اس سے انکار اور سرکشی کرنے والوں کی جڑ کیسے کٹ جایا کرتی ہے۔ اور یوں، حق، حق اور باطل، باطل بن کر دنیا کے سامنے آجائے۔ خواہ مجرمین پر یہ بات کیسی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

اب ہم میدانِ جنگ میں جا پہنچتے ہیں۔ دونوں جماعتیں آمنے سامنے صف آرا ہیں۔ ایک طرف طاغوتی قوتیں اپنی پوری شوکت و شدت کے ساتھ آمادۂ پیکار ہیں۔ دوسری طرف خدا پرستوں کی یہ مختصر سی جماعت جو تین سو تیرہ نفوس پر مشتمل ہے، بے ساز و یراق، حق و صداقت کی مدافعت و حفاظت کے لیے سربکف سامنے کھڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کا معرکہ انسانیت کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والا ہے۔ معاملہ کی نزاکت، اور اس واقعۂ عظیمہ کی اہمیت کے احساس سے نبی اکرم ﷺ کا یہ عالم تھا کہ فوجیں میدان میں ہیں اور حضورؐ اُس خدائے ناصر و معین کی بارگاہِ عالیہ میں جھولی پھیلائے کھڑے ہیں جس کے قانون کی رفاقت و تائید کے بغیر زندگی کے کسی گوشہ میں بھی کامیابی و کامرانی نصیب نہیں ہو سکتی، جھولی پھیلائی ہوئی ہے اور محویت کا یہ عالم ہے کہ ردائے مبارک کندھوں سے گر گر پڑتی ہے اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اسی والہانہ جذب و انہماک سے بحضور رب العزت عرض کرتے ہیں کہ:۔

بارِ الٰہا! اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج مٹ گئی تو پھر قیامت تک تیری عبودیت اختیار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

مانگنے والے نے اس الحاح و زاری سے مانگا۔ اور دینے والے نے اس بذلِ کریمانہ اور ترحم خسروانہ سے نوازا۔

اور کہا کہ

فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ ۝ (۸/۹)

ہم نے تمہاری بات سن لی ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ (اگر دشمن کا لشکر ایک ہزار پر مشتمل ہے تو) ہم تمہاری مدد ایک ہزار ملائکہ سے کریں گے جو مسلسل آئیں گے۔ (یوں کائناتی قوتیں تمہاری مدد کریں گی)۔

ملائکہ کی مدد

یہ ملائکہ کیا کریں گے؟ کیا مسلمانوں سے یہ کہیں گے کہ تم جاؤ۔ آرام سے گھروں میں بیٹھو ہم ان دشمنوں سے خود ہی نپٹ لیں گے؟ نہیں خدا کی نصرت اس طرح نہیں آیا کرتی۔ اس کی نصرت دلوں میں طمانیت و یقین کی بہار آفریں جنتیں بسا دیتی ہے۔ اور دلوں کی حالت بدل جانے سے خارجی دنیا از خود بدل جایا کرتی ہے۔ میدانِ جنگ میں جس چیز پر فتح و شکست کا مدار ہے، وہ سپاہی کی روح ہے اگر اسے اپنے مقصد کی صداقت پر یقین ہے اور اس طرح اسے جمعیتِ خاطر نصیب ہے تو وہ دشمن کے جمِ غفیر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اسی کا نام ملائکہ کی تائید تھی۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ (۸/۱۰)

اللہ نے اس نصرت کے وعدے کو تمہارے لئے خوشخبری بنا دیا تاکہ تمہیں اس سے اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ فتح و نصرت قانونِ خداوندی کے مطابق ملتی ہے۔ وہ قانون جس میں قوت اور تدبیر دونوں موجود ہوتی ہیں۔

سورہ آلِ عمران (آیات ۱۲۶ - ۱۲۲) میں اس حقیقت کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی گئی ہے کہ نزولِ ملائکہ سے مقصود جماعتِ مومنین کے دلوں میں سکون اور اطمینان پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ اس سے اُن کے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو گئی۔

واضح رہے کہ "ملائکہ کی یہ تائید" معرکۂ بدر ہی سے مخصوص نہ تھی۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جہاں اور جب بھی یقینِ محکم کے ساتھ استقامت شامل ہو جائے، ملائکہ کی اس قسم کی تائید ہو جاتی ہے۔ سورۂ حٰمٓ سجدہ میں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ..... مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (۴۱/۳۰-۳۱)

جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار و اعلان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (کائناتی قوتیں ان کے لیے باعثِ تقویت بنتی ہیں اور) ان سے کہتی ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لئے اس

جنتی معاشرہ کی خوش خبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کروگے۔

سی کو دوسری جگہ "خدا اور اس کے ملائکہ کے مومنین پر درود بھیجنے" سے تعبیر کیا گیا ہے (۳۳/۴۳)۔

اس تشریح کے بعد پھر بدر کے میدان کی طرف چلئے۔ اس کے ساتھ ہی خارجی دنیا میں بھی ایک ایسا واقعہ رونما ہو گیا جس سے فضا مسلمانوں کے لیے سازگار ہو گئی۔ قریش چونکہ بدر کی وادی میں پہلے آ پہنچے تھے اس لئے انہوں نے پانی کے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا اس سے مسلمانوں کو فطرۃً تردد ہوا۔ پھر اس وادی میں زمین ریتلی تھی جس سے پیادہ فوج کے پاؤں ریت میں دھنسے جاتے تھے (اور مسلمان تمام تر پیادہ ہی تھے) لڑائی

بارش

کی رات بارش ہو گئی جس سے مجاہدین کے پاس پانی کی بھی افراط ہو گئی اور زمین کی بھی حالت بدل گئی۔ ان کا خوف امن میں بدل گیا تو وہ نہایت اطمینان سے رات بھر سوئے اور صبح تازہ دم میدان میں آ گئے۔ اس کیفیت کو سورہ انفال کی آیات (۱۱-۱۲) میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ مجاہدین کی اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی کا اثر ہوتا ہے جو ان کی تعداد کی کمی اور سامان کی قلت کی تلافی کر دیتا ہے، اور ان کا ایک ایک سپاہی مخالفین کے دو دو سپاہیوں، اور بسا اوقات دس دس پر بھاری ہو جاتا ہے جیسا کہ اُسی سورہ کی آیات (۶۵-۶۶) میں بتایا گیا ہے۔ یہی وہ فرق تھا جو میدانِ بدر میں نمایاں طور پر سامنے آ گیا۔ سردارانِ قریش اور ان کے لشکر اپنی تعداد کے نشہ میں سرشار تھے اور فریقِ مقابل کی تعداد کی قلت اور سامان و اسلحہ کی کمی کے پیش نظر انہیں خاطر میں ہی

ثبات و یقین

نہیں لاتے تھے۔ ادھر مجاہدین کے دل استقامت و عزم اور یقین و ثبات سے ایسے مضبوط ہو چکے تھے کہ وہ فریقِ مخالف کی تعداد سے گھبراتے ہی نہیں تھے۔ انہیں ایک طرف خدا کے اس وعدہ پر کہ ایک ایک مردِ مومن دو دو کفار پر غالب آ جاتا ہے، ایسا پختہ ایمان تھا، اور دوسری طرف اپنی کامیابی پر ایسا محکم یقین کہ دشمنوں کی تعداد، انہیں اپنی تعداد سے زیادہ سے زیادہ دگنی دکھائی دیتی تھی۔ یعنی ان کی اصلی تعداد سے ایک تہائی کم۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو دو مقامات پر بیان کیا ہے ایک سورہ آل عمران کی آیت (۱۳) میں اور دوسرے، سورہ انفال کی آیات (۴۳-۴۴) میں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد فریقِ مخالف سے پہلے ہی کم تھی۔ لیکن کفار کے نشۂ رعونت و تکبر نے یہ کہہ کر اس تعداد کو اور بھی کم کر دکھایا، کہ یہ بے سروسامان مٹھی بھر جماعت ہے ہی کیا؟ اسے ہم ابھی کچل دیں گے۔ دوسری طرف مسلمانوں نے اپنے نصب العین کی صداقت، اور عزم و استقامت کی بنا پر انہیں اپنے سے زیادہ سے زیادہ دُگنا خیال کیا جس پر غالب آنا وعدۂ خداوندی کی

رُو سے یقینی تھا۔ سپاہیوں کی قلبی کیفیت یوں بساطِ مصاف اُلٹ دیا کرتی ہے۔

ثابت قدمی کی تاکید

اب فوجیں آمنے سامنے ہیں۔ اِدھر صحابہ کبارؓ کی وہ جماعت ہے جس کا ایمان ساری دنیا کے مؤمنین کے لیے نمونہ ہے، لیکن انہیں بھی تاکید کی جاتی ہے کہ یاد رکھو! جو باطل کے مقابلہ میں پیٹھ دکھا دے گا، سیدھا تباہی و بربادی کے جہنم میں چلا جائے گا۔

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (۸/۱۶)

مسلمانو! جب کافروں کے لشکر سے تمہاری مٹھ بھیڑ ہو جائے (یعنی وہ تم پر ہجوم کر کے چڑھ دوڑیں، اور تم ان کے مقابل ہو) تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ (سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرو) اور جو کوئی ایسے موقع پر پیٹھ دکھا دے گا، بجز اس کے کہ وہ لڑائی کے لیے پینترا بدلے یا اپنی جماعت کی طرف پناہ جوئی کے لیے رخ کرے تو سمجھ لو کہ وہ خدا کے غضب میں آگیا۔ اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہوا (اور جس کا ٹھکانا دوزخ ہوا تو) اس کے پہنچنے کی جگہ کیا ہی بُری جگہ ہے۔

اطاعت، ضبطِ نفس، استقامت، ایثار اور حق کی مدافعت میں باطل کے مقابلہ کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی؟

اب فوجیں باہم گتھم گتھا ہو گئیں۔ اس مقام پر ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ انسانی دنیا میں خدا کا پروگرام، انسانی جماعتوں کے ہاتھوں جلد تر تکمیل تک پہنچتا ہے۔ جماعت مومنین اسی مقصد کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اس کی زندگی، اس کی موت، سب اسی پروگرام کی تکمیل کے لیے وقف ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ جماعت اس پروگرام کی تکمیل میں جو قدم بھی اٹھاتی ہے، اللہ تعالیٰ اسے خود اپنے عمل سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ جماعت بدر کے میدان میں اسی مقصد کے لیے آئی تھی۔ دیکھئے! ان کے اس اقدام کو اللہ تعالیٰ کس طرح خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاۗءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۸/۱۷)

پھر کیا تم نے انہیں (جنگ میں) قتل کیا؟ نہیں خدا نے کیا۔ (اے رسول!) وہاں تیر اندازی تم نے نہیں کی۔ درحقیقت خدا نے کی تھی۔ اور یہ اس لیے ہوا تھا تاکہ اس کے ذریعہ ایمان والوں کی محنتوں کا ماحصل اور زندگی کا خوشگوار پہلو ان کے سامنے آجائے۔ بلاشبہ اللہ سننے والا علم رکھنے والا ہے!

تم انہیں قتل نہیں کر رہے تھے، خود خدا کا قانون ان کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے لا رہا تھا۔ تلواریں تمہاری تھیں لیکن قانون الٰہی کا ہاتھ تھا جو انہیں چلا رہا تھا۔ تیر تمہارے تھے لیکن قانون مشیت کے فیصلے تھے جو قضائے مبرم بن کر ان کی آنیوں کے ساتھ لپٹ رہے تھے۔ غالبؔ نے اس حقیقت کو کیسے حسین اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است
لیکن کشود آں زکمانِ محمدؐ است

خدا اور عبدِ مومن کے باہمی تعلق کا اظہار، اس سے بہتر انداز میں شاید ہی کہیں اور کیا گیا ہو۔ خدا کے ترکش کے تیر، انسانی کمانوں سے نکل کر ہی حق کے دشمنوں کے سینے میں پیوست ہوتے ہیں۔ بہرحال تھوڑے ہی عرصہ میں سردارِ لشکر عتبہ بن ربیعہ، اس کے بیٹے ولید، اور بھائی شیبہ کی لاشیں میدان میں تھیں، ابوجہل کہ جس کی عداوت و سرکشی کی داستانیں ضرب المثل بن چکی تھیں، انصار کے دو نوجوان بھائیوں (معوذ اور معاذ) کی تلوار سے پیوستِ زمین ہو گیا۔ سرداران لشکر کے قتل سے قریش کے حوصلے پست ہو گئے۔ اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مسلمانوں میں سے (چودہ) مجاہدین نے شہادت پائی۔ کفار کے ۷۰ (ستر) آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ اسیرانِ جنگ میں حضرت عباس، عقیل، اور حضورؐ کے داماد ابوالعاص بھی تھے۔ حق و باطل کے اس پہلے معرکہ میں یوں حق غالب آیا، اور باطل پسپا ہوا کہ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔

ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۸/۱۸)

اور یہ تو ابھی تمہاری پہلی فتح ہے۔ اس کے بعد اللہ کافروں کی مخفی تدبیروں کو (جو دعوتِ حق کے مٹانے کے لیے کر رہے ہیں) نامراد بنا دینے والا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم، نگاہوں کا رُخ اصل حقیقت کی طرف پھیر دیتا ہے۔ وہ رؤسائے قریش سے کہتا ہے کہ تم بات کا فیصلہ افہام و تفہیم سے نہیں بلکہ شمشیر و سناں کے ذریعے چاہتے تھے، سو یہ لو! فیصلہ تمہارے سامنے ہے۔ اسے دیکھ لو اور آئندہ کے لیے فیصلہ کر لو کہ حق و صداقت کی اس تحریک کی مخالفت اسی طرح کئے جاؤ گے، یا اپنے تمرد و رعونت سے باز آجاؤ گے؟

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۸/۱۹)

(اے رؤسائے مکہ) اگر تم فتح مندی کے ظہور کے طلبگار تھے تو دیکھ لو ہماری فتح مندی تمہارے

سامنے آگئی (یعنی جنگ بدر کے نتیجہ نے ہار جیت کا فیصلہ آشکارا کر دیا) اگر تم (آئندہ لڑائی سے) باز آجاؤ تو تمہارے لئے بہتری کی بات ہے، لیکن اگر تم پھر یہی چال چلے تو ہم بھی ایسا ہی کریں گے اور یاد رکھو تمہارا جتھا تمہارے کچھ کام نہ آئے گا اگرچہ بہت سے آدمی اکٹھے کر لو! یقین کرو اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

جنگ کے قیدی

اسیرانِ جنگ کے متعلق چونکہ ابھی کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے انہیں بطور سرکاری مہمان (STATE GUEST) رکھا گیا۔ اور اس غرض کے لیے دو دو چار چار کر کے انہیں صحابہؓ میں بانٹ دیا گیا۔ ان کے پاس کپڑے نہیں تھے اس لئے سب سے پہلے کپڑے فراہم کئے گئے (حضرت) عباس کشیدہ قامت تھے اس لئے کسی کا کرتہ ان کے بدن پر پورا نہیں آتا تھا۔ عبداللہ ابن ابی نے جو خود دراز قد تھا اپنا کرتہ منگا کر دیا۔ (حضرت) عباس نبی اکرمؐ کے چچا تھے۔ ذرا اس احساس احسان کو دیکھئے کہ عبداللہ ابن ابی تمام عمر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتا رہا لیکن اس کی وفات پر نبی اکرمؐ نے خود اپنا کرتہ کفن کے لیے بھیجا اور بخاری کی روایت کے مطابق یہ کرتا اسی کرتے کے بدلے میں تھا۔

قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمر تھا جو فصیح اللسان ہونے کی وجہ سے عام مجمعوں میں نبی اکرمؐ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے تجویز کیا کہ اس کے سامنے کے دو دانت اکھڑوا دیئے جائیں۔ تاکہ یہ آئندہ تقریر کرنے کے قابل نہ رہے۔ یہ چونکہ ذاتی انتقام ہو جاتا اس لیے حضورؐ نے اس کی اجازت نہ دی۔ قیدیوں کے ساتھ کس تواضع کا سلوک ہوتا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگا لیجئے جسے خود ایک قیدی (ابوعزیز) نے بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ جس انصاری نے مجھے اپنے گھر مہمان رکھا تھا ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صبح و شام کھانا لاتے تو کھانا میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوروں پر گذارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا۔ لیکن وہ اسے ہاتھ بھی نہ لگاتے اور زبردستی مجھے کھلا دیتے۔

یہ تھا قیدیوں کے ساتھ سلوک! اللہ اکبر! تربیتِ نبویؐ نے ان "وحشی قبائل" کے افراد کو کیا سے کیا بنا دیا تھا! چونکہ قیدیوں کے متعلق ابھی تک خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا تھا اس لیے آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ قیدیوں کو قتل کر دیا جائے (بلکہ یہاں تک کہ ہر شخص اپنے رشتہ دار قیدی کو خود قتل کر دے) تاکہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان سے زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضورؐ نے اسی رائے کو پسند کیا اور قیدیوں سے زرِ فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا۔ جو ناداری کی وجہ سے زرِ فدیہ نہ دے سکے ان سے کہا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ جو ایسا بھی نہ کر سکتے تھے، انہیں احساناً چھوڑ دیا گیا۔ جن سے زرِ فدیہ لیا گیا ان کے متعلق فرمایا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى لا اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۸/۷۰)

اے رسول! ان قیدیوں سے، جو تمہاری گرفت میں آچکے ہیں، کہدو کہ اگر ہم نے دیکھا کہ تمہارے دل میں خیر سگالی کے جذبات موجود ہیں، تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے، تمہیں اس سے بہتر واپس دے دیا جائے گا اور تمہاری ہر طرح سے حفاظت کی جائے گی۔ قانونِ خداوندی میں حفاظت اور مرحمت کا سامان موجود ہے۔

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ بعد میں جب قرآن میں قیدیوں کی متعلق حکم آیا تو وہ بھی اسی کے مطابق تھا یعنی حکم یہ تھا کہ جنگ کے قیدیوں کو یا تو فدیہ لے کر رہا کر دو یا بطورِ احسان۔ (۴۷/۴)

دل کے نرم گوشے کی دھڑک

اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ ادا کر دیا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ان قیدیوں میں حضورؐ کے داماد (حضرت زینبؓ کے شوہر) ابوالعاص بھی تھے (جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) حضرت زینبؓ بھی ابھی مکہ ہی میں تھیں۔ آخر رسولؐ کی بیٹی تھیں۔ دل کے نازک گوشوں پر نگاہ رکھتی تھیں۔ آپ کی شادی کے وقت ماں (حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ) نے ایک ہار بطور جہیز دیا تھا، شوہر کا زرِ فدیہ بھیجا تو اس کے ساتھ ہی وہ ہار بھی بھیج دیا۔ اس ہار نے زمانہ کی طنابوں کو بیس پچیس برس پیچھے کھینچ دیا، اور حضورؐ کو وفا شعار بیوی کی رفاقت یاد دلا دی، جس نے تمام مصائب اور مشکلات میں بڑی جگر سوزی، اور دل دوزی سے ساتھ دیا تھا۔ گزرے ہوئے واقعات، ایک ایک کر کے سامنے آگئے اور حضورؐ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ ذرا حضورؐ کے مقام کو سامنے رکھئے۔ بحیثیت رسول اور امیر ملت مسلمانوں کے مال و جان کے مختار ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ آپ کے فیصلوں سے سرتابی تو ایک طرف، دل میں گرانی بھی محسوس کرے۔ جی چاہتا ہے کہ اُس کی ماں کی یادگار ہار، بیٹی کو واپس دے دیں۔ لیکن اصول پرستی کا یہ عالم ہے کہ خود فیصلہ نہیں فرماتے۔ صحابہؓ سے کہتے ہیں کہ اگر تم راضی ہو تو اس ہار کو واپس لوٹا دیا جائے۔ سب نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ہار واپس کر دیا گیا۔

سب سے پہلی عید

ماہ رمضان میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا تھا۔ اس لیے جسے عید الفطر کہا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے۔ اس سے پہلے مکی زندگی تھی، مدنی زندگی میں، اپنی آزاد مملکت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے بعد یہ پہلی جنگ تھی جو رمضان کے مہینے میں لڑی گئی اور اس میں ایسی نمایاں کامیابی ہوئی۔ اس لیے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ عید، کس قدر مسرتوں اور شادکامیوں کی عید ہو گی۔ نزولِ قرآن کے جشن کی عید۔ بدر کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی عید یعنی اُس وقت کی دنیا میں، سب سے پہلی اسلامی مملکت کی عید۔ عید کہلانا اسی کے شایانِ شان تھا۔ نہ کہ ہماری رسمی عیدوں کو۔

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنیں

بدر کی شکست نے کفار کے دلوں پر مسلمانوں کی ہیبت بٹھا دی۔ اور اس طرح باطل کا وہ کبر و فر جو اپنی سرکشی اور رعنائی تابی، میں کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ حق کے ساتھ پہلی ہی ٹکر میں بُری طرح مجروح ہوا۔ اور یہی تھی وہ پہلی فتح جس کی یاد مسلمانوں کو بعد میں ان الفاظ میں دلائی جاتی تھی کہ

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥ (۸/۲۶)

اور دلے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) وہ وقت یاد کرو جب (مکہ میں) تمہاری تعداد بہت تھوڑی تھی۔ اور تم ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے، تم اُس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اُچک کر نہ لے جائیں۔ پھر اللہ نے تمہیں (مدینہ میں) ٹھکانا دیا، اپنی مددگاری سے قوت بخشی اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا، تاکہ تم شکر گزار رہو!

نعمائے خداوندی کے دونوں گوشوں پر نگاہ ڈالیے (فَاٰوٰىكُمْ) تمہاری حفاظت کا سامان کیا۔ لیکن اصل مقصد اتنا ہی نہیں تھا کہ تم کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر محصور ہو جاؤ۔ بلکہ مقصد یہ تھا کہ طاغوتی قوتوں کی سرکوبی ہو جائے، تاکہ دنیا میں قوانین حق و عدل کا نفاذ ہو! اس کے لیے تمہارے بازوؤں میں کوہ شکن قوت عطا فرمائی (وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ) جس سے تم نے سرکشی و عدوان کے بڑھتے ہوئے کف بدہاں سیلاب کو روکا اور اس طرح تمہیں آزادی کی فضا میں رزق طیب عطا ہوا (رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ) کہ رزق طیب فی الحقیقت اسی قوم کے نصیب میں ہے جو اس فضا میں سانس لے، جو طاغوتی حکومتوں کے انسانیت کش جراثیم سے پاک ہو اور اسے اس کی معراج کبریٰ تک پہنچنے کے لیے اذنِ بال کشائی دے، غلامی کا رزق تو وہ شجرۃ الزقوم ہے جسے اہلِ جہنم کا مقدر بتایا گیا ہے اس رزق سے تو دم گھٹ کر مرجانا اچھا کہ زہر آلودنانِ شیریں سے فاقہ ہزار درجہ بہتر ہے۔

اے طائرِ لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(از "معراج انسانیت" تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۴۱—۲۵۳)

حقائق و عبر

۱۔ زکوٰۃ کی تقسیم کے دروازے

حالیہ مارشل لاء کے دوران جب ملک میں نظامِ زکوٰۃ کی ابتداء کی گئی تو کچھ علماء نے اس بنا پر کہ یہ سُود سے کاٹی جا رہی ہے، اسے ناپسند کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بینکوں میں پس انداز کی ہوئی رقم پر پہلے آٹھ فیصد سود دیا جاتا تھا لیکن اب اس میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ کے نام پر کاٹ کر باقی ساڑھے پانچ فیصد کھاتہ داروں کو دیا جاتا ہے لیکن اسلامی نظام کی داعی جماعتِ اسلامی نے اسے خالص اسلامی قرار دیتے ہوئے چالاکی سے اس سارے نظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جہاں بھی زکوٰۃ کمیٹیاں قائم ہوئیں ان کے کرتا دھرتا یہی لوگ تھے۔

حال ہی میں وزیراعظم پاکستان کے پاس یہ شکایت پہنچی کہ جماعت اسلامی کے کارکن زکوٰۃ کی اس تقسیم کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ چنانچہ وزیراعظم صاحب نے حکم دیا کہ ان کمیٹیوں کی ازسرِنو تشکیل کی جائے۔ اس کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ مختلف علاقوں میں جماعتِ اسلامی کے جن کارکنوں نے زکوٰۃ کمیٹیوں پر قبضہ کر رکھا تھا ان کا اس علاقے سے تعلق نہیں تھا بلکہ وہ دوسرے علاقوں کے رہنے والے تھے، چنانچہ انہیں زکوٰۃ کمیٹیوں سے خارج کر دیا گیا جس پر جماعتِ اسلامی چیخ اٹھی اور اس کے بارے میں امیر جماعت اسلامی نے حکومت پر یوں نکتہ چینی کی ہے:۔

"لاہور ۲۰ اکتوبر (سٹاف رپورٹر) امیر جماعت اسلامی پنجاب مولانا فتح محمد نے کہا ہے کہ وزیراعظم جونیجو نے زکوٰۃ کمیٹیوں سے جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے عہدیداروں کو الگ کر کے دیانتداری کے ساتھ زکوٰۃ کی تقسیم کا دروازہ بند کر دیا ہے انہوں نے آج یہاں جاری کئے گئے ایک بیان میں مطالبہ کیا ہے۔ کہ مسلم لیگ کی حکومت، جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے کسی عہدیدار کی نشاندہی کرے جس نے زکوٰۃ کی تقسیم میں کوئی بددیانتی کی ہو۔ انہوں نے کہا کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے عہدیداروں کو ان کی دیانت داری کی وجہ اچھی شہرت کا حامل ہونا ایک فطری بات ہے مسلم لیگ کی حکومت کو دیانتدار لوگوں کی قدر کرنی چاہیئے خواہ ان کا تعلق کسی بھی جماعت سے ہو۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

۲۔ شریعت بل پر فرقہ اہل حدیث میں باہمی سر پھٹول

ہمارے ملک میں مختلف فرقوں کے درمیان اختلافات کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ فروعی نوعیت کے ہیں، ان کا اصلِ دین سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ان فروعی اختلافات کی وجہ سے مختلف فرقوں میں باہمی سر پھٹول رہتی ہے۔ پہلے یہ اختلافات مختلف فرقوں کے درمیان ہوتے تھے۔ شریعت بل کے بعد یہ فرقوں کے اندر بھی پیدا ہو گئے ہیں اور اب وہ آپس ہی میں دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں فرقہ اہل حدیث دوسرے فرقوں پر بازی لے گیا ہے۔ اس کا ایک تازہ کارنامہ ملاحظہ ہو۔

"۲۷ اگست کو گوجرانوالہ میں مولانا حکیم عبدالرحمٰن آزاد ناظم سیاسیات مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے مکان پر اہل حدیث یوتھ فورس والوں نے حملہ کر دیا تھا اور ان کے خلاف شدید نعرے بازی کی اور انہیں گالی گلوچ دیں۔ اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے سخت ردِ عمل کا اظہار کیا گیا اور حکیم صاحب کے مکان پر حملے اور انہیں گالی گلوچ دینے کی مذمت کی گئی ہے۔ ذیل میں اس سلسلے میں مختلف حلقوں اور جماعتوں کی طرف سے اخبارات میں شائع شدہ بیانات کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

حکیم عبدالرحمٰن آزاد کی رہائش گاہ پر حملہ شرمناک فعل ہے

گوجرانوالہ جمعیت علمائے اسلام ڈویژن اور ضلع گوجرانوالہ کے راہنماؤں ڈاکٹر غلام محمد احمد لدھیانوی، مولانا عبدالرؤف فاروقی، شیخ خورشید انور نے یوتھ فورس اہلحدیث کی زیادتی اور مولانا حکیم عبدالرحمٰن آزاد کے مکان پر حملہ آور ہونے کی شدید مذمت کی ہے اور کہا کہ مولانا صرف اہلحدیث جماعت کے نہیں بلکہ تمام مکاتبِ فکر کے لیے قابل احترام ہیں اور ضلع گوجرانوالہ کے امن کو بحال رکھنے کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یوتھ فورس نے اشتعال انگیزی کر کے گوجرانوالہ کے امن کو تباہ کرنے کی کوشش ہے۔ انہوں نے کہا کہ شریعت بل کے مقابلے میں کچھ نہ پیش کرنے والے اب اچھے ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔ سیاست میں اس روش کا انجام بہت خطرناک ہوگا۔ انہوں نے ضلعی انتظامیہ سے سوال کیا کہ محرم کے مہینے میں دفعہ ۱۴۴ کے باوجود ایک آبادی کے اندر سرے عام جلسہ کی اجازت کیسے دی گئی ہے۔ انہوں نے واقعہ کے ذمہ دار افراد کے خلاف سخت کاروائی کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ متحدہ شریعت محاذ ہر صورتحال کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن ماحول کو خراب نہیں کرنا چاہیئے۔

(ہفت روزہ اہلحدیث ۱۱ ستمبر ۱۹۸۷ء صفحہ ۱۷)

خیال رہے کہ اہل حدیث یوتھ فورس کا تعلق علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم کے گروپ سے تھا جو شریعت بل کا سخت مخالف تھا۔

۳۔ اسلامی انقلاب کیلئے فوجی ڈکٹیٹروں سے تعاون

الاخوان المسلمون عرب دنیا کی اسلامی جماعت ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ آمروں کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ سوڈان میں اس جماعت نے وہاں کے فوجی ڈکٹیٹر جنرل نمیری سے بھرپور تعاون کیا۔ جنرل نمیری نہ صرف یہ کہ ایک ظالم حکمران تھا بلکہ درپردہ اسرائیل سے بھی ساز باز کئے ہوئے تھا۔ اس نے اسرائیل سے کروڑوں روپے لے کر حبشہ کے یہودیوں کو اسرائیل پہنچایا۔ جب یہ راز کھلا تو عوام نے بغاوت کر کے اسے ملک بدر کر دیا۔ سوڈان کی الاخوان المسلمون جماعت کے امیر پچھلے دنوں جماعت اسلامی کی دعوت پر تشریف لائے تو اس بارے میں ان سے سوال کیا گیا۔ انہوں نے اس کی جو وضاحت کی جماعت اسلامی کے ترجمان ہفت روزہ ایشیا نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"ہم سے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اخوان نے جنرل نمیری سے تعاون کیوں کیا؟ ہمارے مخالفین بھی اس بات کو خاصا اچھالتے ہیں کہ اخوان نے ایک فوجی آمر سے دستِ تعاون بڑھایا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ جنرل نمیری سے تعاون کرنے کا فیصلہ حزب اختلاف کی تمام پارٹیوں پر مشتمل اتحاد نے کیا تھا ان میں اخوان المسلمون بھی تھی۔ ہم نے نمیری سے نچلی سطح پر تعاون کرنے کا فیصلہ کیا۔ نمیری کی حکومت میں شامل ہوتے وقت ہمارے سامنے یہ چند مقاصد تھے۔

۱۔ ہم اپنی تحریک کا کام زیادہ آزادی کے ساتھ بڑھا سکیں گے۔

۲۔ نمیری کو شریعت کے نفاذ پر مجبور کریں گے۔

۳۔ حکومت میں ہوتے ہوئے اس کے غلط کاموں کو روکیں گے۔

۴۔ عوام کی زیادہ بہتر طریقے سے دینی تربیت کر سکیں گے تاکہ وہ ذہنی طور پر اسلامی انقلاب کے لیے تیار ہو جائیں۔

نمیری سے اتحاد اُس وقت کے حالات کے مطابق قومی مصلحت کا تقاضا بھی تھا۔ ہم نے نمیری پر دباؤ ڈالا جس کے تحت اسے شرعی قوانین کو نافذ کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ ہمارے دعوتی کام کو وسعت ملی۔ عوام سے ہمارا رابطہ گہرا اور وسیع ہوا اور معاشرے میں اصلاح کا رجحان بڑھا۔ ہماری اس پالیسی کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ پہلے پارلیمنٹ میں ہمارے صرف پانچ ارکان تھے۔ اب ان کی تعداد ۵۲

ہوگئی ہے اور ہماری تحریک کی عوام میں جڑیں گہری ہوتی جا رہی ہیں۔ نیمری سے اتحاد کا جو فیصلہ ہم نے کیا تھا، اُسے ہم اب بھی صحیح سمجھتے ہیں اور اپنے اس فیصلے پر مطمئن ہیں۔

(ہفت روزہ ایشیا بابت ۸ نومبر ۱۹۸۷ء صـ۲۳)

ہمارے ملک میں جماعت اسلامی بھی مارشل لاء کے ساتھ تعاون کے لیے کچھ اسی قسم کے دلائل دیتی رہتی ہے۔

۴۔ فرقہ اہل حدیث اور ضعیف احادیث

ہمارے ہاں اہلِ حدیث حضرات یہ دعوے کرتے رہتے ہیں کہ بخاری شریف قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے اور اس میں جمع شدہ تقریباً سات ہزار کے قریب احادیث سب کی سب صحیح ہیں۔ لیکن حال ہی میں کسی اہلِ علم نے ایک حدیث کے حوالے سے کسی مسئلہ کے بارے میں اہلِ حدیث کے غلط مسلک کی نشاندہی کی تو فرقہ اہلِ حدیث نے اس حدیث کو صحیح ماننے سے انکار کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ مندرجہ ذیل تین قسم کی احادیث کو ضعیف قرار دے کر ناقابل تسلیم قرار دیا۔ اس کی تفصیل اس فرقہ کے ترجمان ماہنامہ محدث کی زبانی سنیئے۔

"کسی بھی صاحبِ علم و بصیرت سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ وضاعین حدیث اور افسانہ گو قسم کے لوگوں نے تفسیری روایات میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ افسوس کہ ان روایات کو نقل کرنے میں اس درجہ احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا گیا جتنی کہ احادیث کی تدوین میں اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا چنانچہ کتبِ تفسیر و تاریخ و سیَر میں آج بے شمار ایسے اقوال ملیں گے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے بایں سبب ہر دور کے علماءِ محققین و محدثین نے بیشتر تفسیری روایات کو، جو آپؐ یا آپؐ کے اصحابؓ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، نہ صرف قبول نہیں کیا بلکہ ان پر سخت جرح و تنقید بھی فرمائی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ سے تو یہاں تک منقول ہے کہ:۔

"تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں ہے، تفسیر[۱]، ملاحم[۲] اور مغازی[۳]"

(تاریخ تفسیر و مفسرین از پروفیسر غلام احمد حریری صـ۴۹ طبع فیصل آباد)

اور علامہ ابن الجوزیؒ فرماتے ہیں۔

"بہت سے واعظ موضوع احادیث سن لیتے ہیں اور پھر ان کو اسی طرح لوگوں کے سامنے روایت کر دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ سب جھوٹی روایات ہیں ..... آپ ان واعظوں کو ایسی ہی موضوع اور من گھڑت احادیث بیان کرتے ہوئے دیکھیں گے، بلکہ وہ ان میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر

دیتے ہیں تاکہ حدیث اچھی لگے ..... اس قسم کا غلط مواد تفاسیر میں بہت زیادہ ہے۔ الخ"

تحفۃ الواعظین ترجمہ القصاص والمذکرین لابن الجوزی ص ۱۳۴-۱۳۵ طبع کراچی)

اولاً سبائیوں اور مجوسیوں کو ہرزہ سرائیوں اور اسرائیلیات کو ابن جریر الطبری نے اپنی تفسیر میں جگہ دی۔ اگرچہ طبری نے روایات کو مع اسناد ذکر کرنے کا التزام کیا ہے، لیکن وہ اسناد کی جانچ پڑتال محدثین کے معروف و مسلّمہ اصول کے مطابق خود کر کے کسی طرح کا حکم نہیں لگاتے، بلکہ نقد و جرح کی تمام ذمہ داری قاری پر ڈال کر خود کو اس فریضہ سے سبکدوش تصور کرتے ہیں۔ بعد کے مفسرین و شارحین قرآن نے کم و بیش انہی روایات کو اپنی تفاسیر میں نقل کیا ہے۔"

(ماہنامہ محدث جلد ۱۸ نمبر ایک بابت ستمبر ۱۹۸۷ صفحات ۱۳، ۱۴)

خیال رہے کہ صحیح بخاری سمیت صحاح ستہ میں ان اقسام کی احادیث کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے جسے اب خود اہل حدیث حضرات نے ضعیف اور جھوٹا قرار دے دیا ہے۔ یہی بات پرویزؒ صاحب کہتے تھے تو ان پر ابھی تک نازیبا تنقید کے تیر برسائے جا رہے ہیں۔ علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری صاحب بھی اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ جب اس قسم کی تضاد بیانیاں ان کے سامنے آئیں تو انہوں نے بہت سی احادیث کو عجمی سازش قرار دے کر انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کیا عجب کہ ماہنامہ محدث کے ایڈیٹر میں بھی وہی روح پیدا ہو رہی ہو!

درسِ قرآنِ کریم ریکارڈ کرانے کے خواہشمند احباب کی توجہ کیلئے

(AUDIO) آڈیو کیسٹ پر درس ریکارڈ کرانے کی غرض سے **طلوعِ اسلام** ٹرسٹ میں موصول ہونے والی کیسٹ اکثر اوقات آدھی، کم یا زیادہ فارورڈ (FWD) کی ہوئی ہوتی ہیں ایسی کیسٹ کو (REWIND) کرنے اور پہلی ریکارڈنگ صاف کرنے میں خاصہ وقت صرف ہو جاتا ہے۔

احباب سے گذارش ہے کہ ریکارڈنگ کرانے کے لیے یا تو وہ نئی کیسٹ بھیجیں یا پرانی کیسٹ کم از کم (REWIND) کر کے بھیجیں۔

سیلز مینجر

طلوعِ اسلام ٹرسٹ

بابُ المراسلات

قرآنِ کریم، گروہوں میں بٹی ہوئی انسانیت کو اُمتِ واحدہ بنانے کے لیے آیا تھا۔ اس نے بالخصوص جماعتِ مومنین سے تاکید کے ساتھ کہا کہ

لَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ ۳۰/۳۱/۳۲

لیکن ہمارے علماء کرام پہلے اس اُمتِ مسلمہ کو جسے قرآن اُمَّةً وَاحِدَةً ۲۱/۹۲ کہہ کر پکارتا ہے، فرقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور پھر اپنی اس غیر قرآنی روش کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کیسی کیسی تاویلیں کرتے ہیں، اس کی ایک جھلک ذیل کے ایک مراسلہ میں قارئین کے سامنے پیش کی جاتی ہے جسے پشاور سے ہمارے ایک دوست نے ہمیں ارسال کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے!

اسلام میں چاروں مذاہب برحق ہیں؟

جناب ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب پچھلے دنوں پشاور بار میں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے بجائے کسی ایک موضوع پر خیال آرائی کے سوال و جواب کے سلسلہ کو ترجیح دی جسے وکلا صاحبان نے قدر کی نظر سے دیکھا۔ یہ تمام کاروائی ٹیپ کر دی گئی اور پھر ٹیپ ہی سے (جو محفوظ ہے) ایک سوال اور اس کا جواب قارئین کی نظر کیا جاتا ہے۔

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے چاروں مذاہب کے برحق ہونے میں ایسے دلائل دیئے جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا حضورؐ کی حدیث ہے "اختلاف امتی رحمۃ" اور یہی مذہب کی روح ہے۔ آپ نے اپنے فرقہ کے حق میں بھی دلائل دیئے۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاتا کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ" اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جیسا کہ آپ نے فرمایا چاروں مذاہب برحق ہیں۔ پھر یہ برحق ہونے کی سند نہ قرآن سے اور نہ ہی کسی حدیث سے ثابت ہے۔ مجھ سے میرے عمل جو میں نے مثقال ذرۃ کی حد تک کیوں نہ ہو باز پرس ہوگی۔ لہٰذا اگر میں عمل کو درست رکھنے کی خاطر پورے ایک سال کو چار حصوں میں تقسیم کر دوں اور ہر ایک مذہب پر تین تین ماہ عمل کرتا رہوں اس طرح میرے قول و فعل میں تفاوت بھی نہ ہوگا اور مذہب کے برحق

ہونے کا حق بھی ادا ہو جائے گا۔ اس کی وضاحت چاہوں گا آیا میرا یہ عمل بارگاہِ ایزدی میں قابل قبول ہو گا یا نہیں کیونکہ اصولی طور پر قبول ہونا چاہیئے۔

جواب۔ از ٹیپ۔

ائمہ کرام صاحبِ اجتہاد ہیں اور صحیح فیصلے پر پہنچے اگر صحیح فیصلہ کریں تو اُسے دو اجر ملتے ہیں اور اگر وہ اجتہاد کرے اور واقعتہً کسی غلط رائے کے نتیجے پر پہنچے تو چونکہ اجتہاد حسنِ نیت پر مبنی ہے سو اس کو بھی ایک اجر ملتا ہے۔ اس حدیث کی رو سے ہم کہتے ہیں کہ حضور صلعم نے اجتہاد "جو ائمہ مجتہدین کے فیصلے ہوئے اگر واقعتہً ایک غلط بھی ہو گا۔ واقعتہً۔ تو اس حدیث کی رُو سے اللہ پاک کی بارگاہ میں وہ بھی موجود ہے۔ اُس پر بھی اجر ہے۔ اس لیے تمام فقہی مذاہب ائمہ مجتہدین کے اجتہادات کی بنا پہ قائم ہوئے مبنی برحق تو ضرور کہے جاتے ہیں ان پر عمل کرنا باعثِ اجر ہے ——— (میں نے چاروں کی بات کی ہے) میں چار کی بات کر رہا ہوں۔

اب میں آگے چلتا ہوں اب یہ آرا فقہی بے شک ہیں لیکن بات یہ ہے۔ کہ ایک چیز ہوتی ہے INTEGRITY۔ ایک چیز ہم کہتے ہیں اُس کو INTEGRITY AND UNITY OF PERSONALITY۔ AND UNITY OF PERSONALITY کہ شخصیت کے اندر ایک وحدت ہے۔ میں نے حکمت تو عرض کر دی کہ ایک علاقے کے لوگ یعنی علاقوں کی بنا پر ایک دوسرے کو FOLLOW کر لیں دوسرے اس کو FOLLOW کر لیں۔ تیسرے اس کو FOLLOW کر لیں اور حکمتِ الٰہی نے اور مشیتِ الٰہی نے اسی طرح مذاہب کو تقسیم بھی کر دیا دنیا میں۔ مگر ایک شخص کی اپنی PERSONALITY کی UNITY اور اس کی PERSONALITY کی INTEGRITY ایک تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت میں جس طرح قول کے اندر وحدت پیدا کرتا ہے اس طرح عمل کے اندر وحدت پیدا کرتا اور عمل کے اندر وحدت کے ساتھ مجموعی عمل کے اندر یکسانیت بھی پیدا کرے ایسا نہ ہو کہ اُن مسائل کے باہمی اختلافات میں ایک مرحلے پر وہ ایک طرح عمل کرتا ہوا پایا جائے دوسرے مرحلے پر وہی دوسری شکل پر عمل کرتا ہوا پایا جائے۔ تیسرے مرحلے پر تیسری شکل پر عمل کرتا ہوا پایا جائے تو نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ اُس ایک شخص کی وحدتِ کردار بھی متاثر ہو جاتی ہے سو اُمتِ مسلمہ کے ہاں اکثریتی فقہی مذاہب مختلف علاقوں میں بٹ جانے سے پرابلم اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ قانون اور فقہی جو LAW ہے ضابطہ۔ وہ ENFORCE تو STATEWISE ہوتا ہے کہ جس ملک میں جس فقہی مذہب کے پیروکاروں کی اکثریت ہو گی۔ جمہوری اور اسلامی ضابطے کے مطابق FUNDAMENTAL LAW جو ہے۔

BASIC STRUCTURE اُسی تعمیر کے مطابق بن جائے گا اور باقیوں کو ACCOMODATE کرنے کی ازروئے شرع اجازت ہو گی۔ WHEN AND WHERE REQUIRED۔ لیکن یہ کہ ہر فرد کو اختیار دے

اس حقیقت کو راسخ کیا جائے کہ بقول نسیم حجازی، ہندو نے اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ان ہاتھوں کا انتخاب کیا جن کی انگلیوں پر قرآنِ حکیم کی تفسیر لکھنے والے قلم کی سیاہی کے تازہ نشان موجود تھے۔

اس سلسلہ میں ہم محترم پرویزؒ صاحب کا وہ مضمون پیشِ خدمت قارئین کر رہے ہیں جو انہوں نے اگست ۱۹۴۱ء میں تحریر کیا تھا اور جس کا عنوان ہے ——— کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

طلوعِ اسلام

(نوشتہ اگست ۱۹۴۱ء)

کچھ عرصہ سے دنیائے مذاہب میں ایک رسم سی پیدا ہو گئی ہے مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کیے جاتے ہیں جن میں مختلف ادیانِ عالم کے نمائندے اپنے اپنے مذاہب[1] کے محاسن بیان کرتے ہیں۔ ان تقاریب سے مقصد بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اہلِ مذاہب ایک دوسرے کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں اور یوں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے جو لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اگرچہ اس مقصد کی عمدگی اور ان اجتماعات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن میں نے جب کبھی ان اجتماعات کی روئیداد کو پڑھا مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان میں (کم از کم) اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں بہت کم پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام امن و سلامتی کا پیغامبر اور نوعِ انسانی کے لیے آیۂ رحمت ہے، اس لیے اس میں غیر مذاہب سے رواداری، حسنِ سلوک اور وسعتِ نظر کی تعلیم عام ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کے مقابلہ میں ایک خاص افضلیت کا مدعی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ خدا کا پیغام اپنی اصلی شکل میں آج صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے جو خدا کا آخری پیام اور ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو قیامت تک کے لیے انسانی زندگی کی ہر شاخ میں ہدایت کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ ان اجتماعات میں اسلام کی وسعتِ نظر، کشادگیٔ ظرف، رواداری، حسنِ سلوک کا چرچا تو عام کیا جاتا ہے لیکن اس کی اس خصوصیت، یعنی اس کی افضلیت و اکملیت، برتری اور فوقیت کے متعلق ایک حرف زبان تک نہیں لایا جاتا کیونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح دیگر اہلِ مذاہب کی دل شکنی ہو گی اور وہ اسلام کے نمائندہ کو "متعصب اور تنگ نظر" خیال کریں گے۔ لہٰذا رواداری اور کشادہ نگہی کے اس غلط مفہوم سے متاثر ہو کر اسلام کے نمائندوں کو اسلام کی صحیح ترجمانی کا حوصلہ نہیں پڑتا اور وہ ان اجتماعات میں کچھ ایسے سمٹے سمٹائے، جھجکتے لجاتے ہوئے آتے ہیں۔

---

[1] اسلام کے لیے "مذہب" کا لفظ دوسروں سے تقابل کی خاطر لکھ دیا گیا ہے، ورنہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔

چوزاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

اس نقطۂ خیال سے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس قسم کی کانفرنسیں کسی بہتر نتیجہ کی طرف منجر نہیں ہوتیں۔ بلکہ میں تو ایک عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہ چیز بجائے فائدہ کے نقصان کا باعث ہو رہی ہے۔ ان اجتماعات کے انعقاد سے یہ مقصد ہو یا نہ ہو، لیکن اس کا نتیجہ یقیناً یہی مرتّب ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ اسلام کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت کو پسِ پشت ڈال کر، اسے دوسرے مذاہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ واقعات آہستہ آہستہ بتا رہے ہیں کہ یہ خدشہ موہوم اور یہ احتمال قیاسی نہیں۔

اوائلِ جون ۱۹۴۱ء میں شولاپور کے مقام پر، اسی قسم کی "تمام مذاہب کی کانفرنس" منعقد ہوئی جس کے صدر ہندو قوم کے مشہور کارکن، پنڈت سُندر لال جی تھے۔ اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندہ نے جو کچھ کہا اس کی تفصیل تو معلوم نہیں ہو سکی، البتہ جنابِ صدر نے اپنے خطبہ میں پورا زور اس بات کے ثابت کرنے میں لگا دیا کہ اسلام خود تسلیم کرتا ہے کہ نجات و سعادت کی راہیں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اور کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ اصلِ مذہب "خدا پرستی اور نیک عملی" کی زندگی ہے اور یہ اصل ہر مذہب میں موجود ہے۔ فرق صرف شرع و منہاج (فروعات) میں ہے، اور یہ فرق کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔

جناب آزاد کی تفسیر

پنڈت جی نے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا، بلکہ شروع سے آخر تک، جناب ابوالکلام صاحب آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ (ترجمان القرآن جلد اول) سے شرح و بسط سے اقتباسات پیش کر دیئے۔ جن سے حرفاً حرفاً ان کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ ہندوؤں کی طرف سے اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا تھا اور پنڈت جی نے خطبہ میں اس کا حوالہ پیش کیا ہے۔ مجھے نہ تو ان امیال و عواطف سے کچھ بحث ہے جو اس تفسیر کے محرک ہوئے، اور نہ ان مقاصد سے واسطہ جو اس کے ہندی ترجمہ اور اس کی عام اشاعت سے پیشِ نظر ہیں۔ مجھے تو قرآن کریم کے ایک طالبِ علم کی حیثیت سے یہ دیکھنا ہے کہ یہ خیالات قرآن کریم کی رُو سے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اس سے پیشتر بھی نجماً نجماً بہت کچھ لکھا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر تفصیلی طور پر لکھا جائے تاکہ ان خیالات کو عام کرنے والے یہ کہہ کر فریب خوردگی اور فریب دہی کے مرتکب نہ ہو سکیں کہ اسلام خود اس تعلیم کا مؤید ہے۔ اس تفصیلی بحث کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے، جب یہ محسوس کیا جائے کہ ہمارے نوجوان طبقہ پر اس تعلیم کا کیا اثر پڑ رہا ہے؟ تمام مذاہب یکساں ہیں۔

چو زاہدے کہ بہ بزم شراب می آید

اس نقطۂ خیال سے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس قسم کی کانفرنسیں کسی بہتر نتیجہ کی طرف منجر نہیں ہوتیں۔ بلکہ میں تو ایک عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہ چیز بجائے فائدہ کے نقصان کا باعث ہو رہی ہے۔ ان اجتماعات کے انعقاد سے یہ مقصد ہو یا نہ ہو، لیکن اس کا نتیجہ یقیناً یہی مرتب ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ اسلام کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت کو پس پشت ڈال کر، اسے دوسرے مذاہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ واقعات آہستہ آہستہ بتا رہے ہیں کہ یہ خدشہ موہوم اور یہ احتمال قیاسی نہیں۔

اوائل جون ۱۹۴۱ء میں شولاپور کے مقام پر، اسی قسم کی "تمام مذاہب کی کانفرنس" منعقد ہوئی جس کے صدر ہندو قوم کے مشہور کارکن، پنڈت سُندر لال جی تھے۔ اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندہ نے جو کچھ کہا اس کی تفصیل تو معلوم نہیں ہو سکی، البتہ جناب صدر نے اپنے خطبہ میں پورا زور اس بات کے ثابت کرنے میں لگا دیا کہ اسلام خود تسلیم کرتا ہے کہ نجات و سعادت کی راہیں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اور کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ اصل مذہب "خدا پرستی اور نیک عملی" کی زندگی ہے اور یہ اصل ہر مذہب میں موجود ہے۔ فرق صرف شرع و منہاج (فروعات) میں ہے، اور یہ فرق کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔

جناب آزاد کی تفسیر

پنڈت جی نے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا، بلکہ شروع سے آخر تک، جناب ابوالکلام صاحب آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ (ترجمان القرآن جلد اول) سے شرح و بسط سے اقتباسات پیش کر دیئے۔ جن سے حرفاً حرفاً ان کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ آپ کو غالباً معلوم ہو گا کہ ہندوؤں کی طرف سے اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا تھا اور پنڈت جی نے خطبہ میں اس کا حوالہ پیش کیا ہے۔ مجھے نہ تو ان امیال و عواطف سے کچھ بحث ہے جو اس تفسیر کے محرک ہوئے، اور نہ ان مقاصد سے واسطہ جو اس کے ہندی ترجمہ اور اس کی عام اشاعت سے پیش نظر ہیں۔ مجھے تو قرآن کریم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ دیکھنا ہے کہ یہ خیالات قرآن کریم کی رُو سے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اس سے پیشتر بھی نجماً نجماً بہت کچھ لکھا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر تفصیلی طور پر لکھا جائے تاکہ ان خیالات کو عام کرنے والے یہ کہہ کر فریب خوردگی اور فریب دہی کے مرتکب نہ ہو سکیں کہ اسلام خود اس تعلیم کا مؤید ہے۔ اس تفصیلی بحث کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے، جب یہ محسوس کیا جائے کہ ہمارے نوجوان طبقہ پر اس تعلیم کا کیا اثر پڑ رہا ہے؟ تمام مذاہب یکساں ہیں۔

اس حقیقت کو راسخ کیا جائے کہ بقول نسیم حجازی، ہندو نے اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ان ہاتھوں کا انتخاب کیا جن کی انگلیوں پر قرآنِ حکیم کی تفسیر لکھنے والے قلم کی سیاہی کے تازہ نشان موجود تھے۔

اس سلسلہ میں ہم محترم پرویزؒ صاحب کا وہ مضمون پیشِ خدمت قارئین کر رہے ہیں جو انہوں نے اگست ۱۹۴۱ء میں تحریر کیا تھا اور جس کا عنوان ہے ——— کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

طلوعِ اسلام

(نوشتہ اگست ۱۹۴۱ء)

کچھ عرصہ سے دنیائے مذاہب میں ایک رسم سی پیدا ہو گئی ہے مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کیے جاتے ہیں جن میں مختلف ادیانِ عالم کے نمائندے اپنے اپنے مذاہب[1] کے محاسن بیان کرتے ہیں۔ ان تقاریب سے مقصد بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اہلِ مذاہب ایک دوسرے کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں اور یوں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے جو لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اگرچہ اس مقصد کی عمدگی اور ان اجتماعات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن میں نے جب کبھی ان اجتماعات کی روئیداد کو پڑھا مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان میں (کم از کم) اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں بہت کم پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام امن و سلامتی کا پیغامبر اور نوعِ انسانی کے لیے آیۂ رحمت ہے، اس لیے اس میں غیر مذاہب سے رواداری، حسنِ سلوک اور وسعتِ نظر کی تعلیم عام ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کے مقابلہ میں ایک خاص افضلیت کا مدعی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ خدا کا پیغام اپنی اصلی شکل میں آج صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے جو خدا کا آخری پیام اور ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو قیامت تک کے لیے انسانی زندگی کی ہر شاخ میں ہدایت کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ ان اجتماعات میں اسلام کی وسعتِ نظر، کشادگیٔ ظرف، رواداری، حسنِ سلوک کا چرچا تو عام کیا جاتا ہے لیکن اس کی اس خصوصیت، یعنی اس کی افضلیت و اکملیت، برتری اور فوقیت کے متعلق ایک حرف زبان تک نہیں لایا جاتا کیونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح دیگر اہلِ مذاہب کی دل شکنی ہو گی اور وہ اسلام کے نمائندہ کو "متعصب" اور تنگ نظر" خیال کریں گے۔ لہٰذا رواداری اور کشادہ نگہی کے اس غلط مفہوم سے متاثر ہو کر اسلام کے نمائندوں کو اسلام کی صحیح ترجمانی کا حوصلہ نہیں پڑتا اور وہ ان اجتماعات میں کچھ ایسے سمٹے سمٹائے، جھجکتے لجاتے ہوئے آتے ہیں۔

---

[1] اسلام کے لیے "مذہب" کا لفظ دوسروں سے تقابل کی خاطر لکھ دیا گیا ہے، ورنہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔

عالمگیر سچائیاں سب میں ایک جیسی ہیں۔ خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی نجات و سعادت کی ضامن ہے۔ ہدایت خدا کی رحمت ہے جو کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہو سکتی۔ وغیرہ وغیرہ خیالات ایسے نظر فریب اور خوش آئند ہیں کہ سطح بین نگاہیں فوراً اس سحر سے مسحور ہو جاتی ہیں۔ اور جب اس سطحی کشش و جاذبیت کو جناب آزاد جیسے مفسرِ قرآن کی تائید بھی حاصل ہو جائے تو اس سحر کے سحرِ حلال بن جانے میں کونسی شے مانع ہو سکتی ہے ؟

اکبر کا دینِ الٰہی

رواداری کے اس نظر فریب مفہوم اور وسعتِ نگاہ کی اس سراب آسا تفسیر کی پہلی جھلک ہمیں شہنشاہ اکبر کے دینِ الٰہی میں ملتی ہے۔ جس طرح وہ جذبات و مقاصد جو اس تحریک کے محرک تھے، تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں، اسی طرح وہ مساعیِ جمیلہ بھی ان کی نگاہوں سے مستور نہیں جو اس اسلام سوز نظریہ کے ابطال و استیصال کے لیے مجاہدانہ انداز سے معرضِ وجود میں آئیں۔ برہمو سماج فرقہ کی تحریک بھی قریب قریب انہی بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے، لیکن چونکہ یہ تحریک مسلمانوں کی طرف سے وجود میں نہیں آئی۔ اس لیے وہ ہمارے دائرۂ تنقید سے باہر ہے۔

اس کے بعد یہی نظریہ موجودہ سیاسی کشمکش کے طوفان میں سطح کے اوپر لایا گیا۔ اس نظریہ کی اشاعت کی موجب جناب آزاد کی تفسیر ہوئی اور اس طرح سے یہ چیز مسلمانوں میں دین کی حیثیت سے پھیل گئی۔ جناب آزاد مسلمانوں میں ایک عالم دین اور مفسر کی حیثیت سے امتیاز حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان اور قلم کا مسلمانوں کے دلوں پر گہرا اثر تھا۔ اس لیے اس تفسیر کا ایک عرصہ سے انتظار ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ اس کا استقبال ہوا۔ لوگوں نے اسے آنکھوں سے لگایا، سر پہ اٹھایا، اور مختلف گوشوں اور متنوع حلقوں سے اس کی تعریف اور توصیف میں غلغلہ انداز نعرے بلند ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جناب آزاد کے ترجمہ میں ایک خصوصیت ضرور ہے جس کی تعریف نہ کرنا بخل ہوگا، لیکن بحث تو ان کے اس نظریہ سے ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ کتاب کی اشاعت کے زمانے میں وفورِ شوق اور جوشِ عقیدت کے اس والہانہ ہجوم میں کسی کی نگاہ اس طرف نہ اٹھی۔ برسنگِ خود بینی نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس اژدحامِ مدح و ستائش میں یہ توفیق اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو عطا فرمائی کہ جناب آزاد اور اہلِ نظر طبقہ کی توجہ اس بنیادی غلطی کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس تفسیر کے ذریعے سے عام ہونے والی تھی چنانچہ مجلہ معارف (بابت جنوری ۱۹۳۳ء) میں میرا وہ مضمون شائع ہوا جس میں تفسیر کے اس حصہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔

گئی تھی۔ اس مضمون کو ارباب نظر کے حلقہ میں مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے بعد مختلف گوشوں سے جناب آزاد کے نظریہ کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں۔ اس واقعہ کو آٹھ نو برس ہو چکے ہیں۔ چونکہ وہ تنقیدی مضامین جو اس نظریہ کے خلاف شائع ہوئے تھے لوگوں کی نگاہوں سے وقتی طور پر گذرے، اس لیے ان کی یاد محو ہوتی چلی گئی (متفرق مضمونوں کا اثر ہوتا بھی وقتی ہے)۔ اور تفسیر چونکہ مستقل کتاب کی شکل میں ہے، اس لیے وہ ہر وقت سامنے رہی۔ اس کے بعد بھی جب کبھی اس نظریہ کا چرچا عام ہونے لگا، میں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ تین برس ادھر سے کبھی کبھار مجلۂ طلوع اسلام میں بھی اس کا تذکرہ چھڑتا رہا، لیکن بایں ہمہ۔ یہ وقتی کوششیں ایک مستقل تصنیف کے مقابلہ میں زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ تاوقتیکہ انہیں بہ تسلسل جاری نہ رکھا جائے۔ بالخصوص جبکہ اس نظریہ کی اشاعت میں غیر مذاہب کے لوگ بھی کوشاں ہوں۔ میرے نزدیک اسلام کے لیے یہ نظریہ بہت بڑا خطرہ اپنے اندر رکھتا ہے، اس لیے کہ جب آپ ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیں کہ اسلام میں دیگر مذاہب کے مقابلہ میں کوئی مابہ الامتیاز خصوصیت نہیں تو اس کے بعد اسلامی نظامِ زندگی سے شیفتگی اور اس کی سرفرازی کے لیے آرزوئیں اور کوششیں سب ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی تمام سیاسی جدوجہد بھی، جسے اس قدر اہمیت حاصل ہے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے[1]۔ قوموں کی زندگی کا راز ان کے عقیدہ (نصب العینِ حیات) سے وابستہ ہے۔ جس قدر کسی قوم کا مطمح نظر (عقیدہ) بلند اور اس کے افراد کو جس قدر اس سے عشق ہوگا، اتنی ہی وہ قوم زندگی کی دولت سے بہرہ یاب ہوگی۔ نظریۂ حیات (عقیدہ) کی ایک ذرا سی غلطی قوم کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ گاڑی جب کانٹا بدلتی ہے تو دونوں لائنوں میں انچ بھر کا غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے، لیکن اس کانٹا بدلنے میں اگر ایک نمبر کی بھی غلطی ہو جائے تو تھوڑے عرصہ کے بعد وہ گاڑی نہ صرف اپنی منزل ہی سے کوسوں دور ہو جائے گی بلکہ اسے ہر قدم پر ہلاکت اور تباہی کا سامنا ہوگا۔ میرے نزدیک جناب آزاد کا نظریہ ایک ایسی ہی ہلاکت آفریں غلطی ہے جو اگر بدستور قائم رہی تو نہ معلوم کسی وقت کیا رنگ لا کر رہے۔ یہی وہ احساس ہے جو مجھے بار بار اس موضوع پر لکھنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب! آجکل دوسرے مذاہب کے پیرو اس روش کی طرف آ رہے ہیں کہ وہ اپنے ہی

[1] حصول پاکستان کی تحریک کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ مسلمان، اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ایک آزاد مملکت کی ضرورت ہے۔

مذہب کو سب سے اعلیٰ دارفع نہیں بتاتے بلکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا مذہب بھی باقی مذاہب جیسا ہے۔ اس طرح وہ رنگ خود بخود بدل رہا ہے جس میں مباحث و مناظرات کے اکھاڑے قائم ہوا کرتے تھے اور ہر مذہب والا اپنے مذہب کی اوّلیت و افضلیت ثابت کرنے میں نبرد آزمائی کرتا تھا۔ دوسرے مذاہب والوں کا تو یہ مسلک ہے، اور ادھر یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کو پھر اسی مقام پر پہنچ جانے کی تلقین کی جا رہی ہے۔

تنگ نظری کا طعنہ

اس میں شبہ نہیں کہ ناروا بحث و جدل عمدہ نتائج کی حامل نہیں ہوتی اور میں اس میں ہمیشہ اجتناب کرتا ہوں، لیکن معترض حضرات ذرا سوچیں تو سہی کہ وہ کیا فرما رہے ہیں؟ جس چیز کو وہ دیگر اہلِ مذہب کی وسعتِ نگاہ اور تنگ نظری قرار دے رہے ہیں اس کی اصلیت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ (مثلاً) زید کا ایک بچہ ہے۔ بڑا غبی اور نالائق۔ عمر کا ایک بچہ اس کے مقابلہ میں بڑا ذکی اور ذہین ہے۔ زید ہر مقام پر کہتا پھرتا ہے کہ صاحب! میں تو کبھی یہ نہیں کہتا کہ میرے بچے کو کوئی خاص افضلیت حاصل ہے۔ میرے نزدیک تو میرا اور عمر کا بچہ بالکل یکساں ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تو عمر کی خود ستائی ہے کہ اپنے بچے کے برابر کسی اور کو سمجھتا ہی نہیں۔

فرمائیے کہ یہ اصول، زید کی وسعتِ نظر اور عمر کی تنگ دامنی کا آئینہ دار ہے یا کسی اور حقیقت کا غماز؟

دورِ حاضر میں زمانے کے تقاضوں سے ہوا یہ ہے کہ اسلام کے سوا باقی تمام مذاہب کو وقت پیش آ رہی ہے کہ نہ ان کے معتقدات علم و عقل کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے ہیں نہ ان کے اصول و ضوابط انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور گوناگوں مقتضیات کے لیے کوئی حل پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہیں آئے دن اپنی عملی ضروریات کے لیے ادھر ادھر سے اصول و قوانین مستعار لینے پڑتے ہیں۔ اس لیے وہ مذاہب انسان کی برق رفتار ترقی کا ساتھ دینے سے قطعاً قاصر ہیں۔ رفتہ رفتہ ان مذاہب کے ماننے والوں کی حالت یہ ہوتی جا رہی ہے کہ انہیں نہ اپنے عقائد پر یقین رہا ہے اور نہ ہی اپنے مذہب سے وابستگی۔ وہ مذہب سے برگشتہ ہو رہے ہیں اور ان کی یہ برگشتگی بعض صورتوں میں سرکشی اور بغاوت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ قوم کی زندگی کا راز عقائد سے وابستگی میں مضمر ہے۔ اس لئے ان مذاہب کے اربابِ حل و عقد کو خطرہ ہے کہ کہیں اس طرح رفتہ رفتہ یہ شیرازہ ہی منتشر نہ ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں وہ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کس طرح انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دیتا ہے۔ انہیں خطرہ ہے کہ ان حالات کے پیشِ نظر ان کے مذاہب کے پیروؤں کا سمجھدار طبقہ اسلام کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ ان حالات کے ماتحت وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان کا اپنے مذہب گزیدہ نوجوانوں سے یہ کہنا کہ ان کا

مذہب تمام مذاہبِ عالم سے اعلیٰ و افضل ہے، کس قدر بے نتیجہ اور بے معنی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس خطرہ سے بچنے کی وہی راہ نکالی ہے جو زید نے اپنے بچے کے متعلق اختیار کی تھی۔ انہوں نے یہ کوشش شروع کر دی ہے کہ اگر ان کا مذہب اتنا اونچا نہیں جا سکتا جہاں اسلام ہے تو یہی کیا جائے کہ اسلام کو اس کی سطح سے نیچے اتار کر اپنے مذہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جائے اور اس طرح ان کے مذہب سے برگشتہ ہونے والوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ مذاہب سب ایک جیسے ہیں۔ اس لیے اپنے مذہب سے یہ سمجھ کر بیزار نہ ہو جائے کہ اس سے بہتر مذہب بھی دنیا میں موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ مذہب کا دائرہ پرستش اور عبادت تک محدود ہے۔ اس اعتبار سے سب یکساں ہیں۔ باقی رہا نظامِ زندگی، سو وہ مذہب سے الگ شے ہے۔ اسے قوم کی اجتماعیت تشکیل دیتی ہے۔ اس لیے اس اعتبار سے قومیت ہی وہ نقطہ ہے جس سے متمسک رہنے میں رازِ حیات ہے ان زیرک حضرات نے اس طرح اس آنے والے خطرہ سے اپنی قوم کو بچا لیا ہے۔ یعنی اپنے مذہب کی کمزوری کو "وحدتِ ادیان" کے نقاب میں چھپا لیا، اور قوم کی اجتماعیت کے لیے ایک دوسرا محاذ (قومیت) تلاش کر لیا۔

یہ ہیں وہ مقتضیات و عواطف جن کے ماتحت "یکسانیتِ مذاہب" کی یہ تحریک وجود کوش ہوئی ہے آپ مختار ہیں کہ اس کا نام جو جی میں آئے رکھ لیجئے۔ لیکن ذرا اس شخص کی کیفیتِ قلب کا بھی تو احساس کیجئے جو یہ مانتا ہو کہ یہ زمانہ آنا تھا جس میں تمام مذاہب والے اپنے اپنے مذہب کے ناقص ہونے کے اعتراف پر مجبور ہو جائیں۔ یعنی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات انہیں اس امر کے اعتراف پر مجبور کر دیں کہ ان کا مذہب واقعی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں اسلام کے دینِ حقیقی ہونے کا دعویٰ علیٰ وجہ البصیرت دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا تھا۔ اور یوں اس کی افضلیت و اکملیت کا اقرار لیا جا سکتا تھا۔ یہی وہ حالات تھے جن میں قرآن کے اس دعویٰ کو ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آنا تھا کہ

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹/۳۳)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ حیات اور نظامِ خداوندی دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام تمام نظامہائے عالم پر غالب آجائے۔ خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

جو شخص قرآن کی اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان رکھتا ہو، کہیئے کہ جب وہ دیکھے کہ عین اس زمانہ میں خود اسلام کے نام لیواؤں کی طرف سے یہ نظریہ پیش ہو رہا ہے کہ "تمام مذاہب یکساں ہیں"، تو وہ کس طرح اس

عقیدہ مبنی علی الحقیقت اور اس کی اشاعت کو خدمت اسلام قرار دے لے۔

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم یہ دعویٰ کرو گے کہ ہمارا مذہب تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور نجات و سعادت اس سے باہر اور کہیں نہیں، تو اسی قسم کا دعویٰ دوسرے اہلِ مذاہب بھی کرنے لگ جائیں گے اور پھر وہی تقابل و توازن کا سوال پیدا ہو جائے گا۔ سو اوّل تو اب مقابلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دن گئے جب نظری مسائل کی بنا پر مباحثات و مناظرات کی بزم آرائیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ ساری دنیا، اپنے اپنے نظریاتِ زندگی سے تنگ آچکی ہے اور انہیں تلاش ہے کہ کہیں سے ایسا نظریۂ حیات مل جائے جس کے ماتحت انسان امن و سلامتی کی زندگی بسر کر سکے۔ جن اقوام نے قومیت کو امن و سکون کا ضامن بتایا تھا وہ اب محض

دست ترِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

کے مطابق طوعاً و کرہاً تباہ کر رہے ہیں۔ ان حالات میں تقابل کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اب تو صرف صحیح اسلام کو اجاگر کرنے کی دیر ہے، تشنہ لب دنیا خود بخود اس چشمۂ حیات کے گرد جمع ہو جائے گی لیکن اگر مقابلہ کے سوال کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی مقابلہ سے گھبراتا کون ہے؟ عمر کے لیے تو یہ چیلنج نویدِ مسرت ہے کہ اس کے اور زید کے بیٹے کو مقابلہ کے امتحان میں بٹھا دیا جائے۔ اگر دنیا پوچھنا چاہتی ہے تو بڑی خوشی سے پوچھ لے ہم بتائیں گے کہ ان کے نظریاتِ زندگی کہاں کہاں اور کیوں ناکام رہے اور ان کے مقابلہ میں اسلام کون سا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے جو ان تمام اسقام و عیوب سے پاک ہے۔ لیکن اس وقت میرا تخاطب غیر مذاہب والوں سے نہیں۔ اس وقت میں صرف انہیں مخاطب کرنا چاہتا ہوں۔ جو مسلمان کہلانے کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اس تخصیصِ تخاطب سے مقصد یہ ہے کہ ہم اس نظریہ کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھیں گے۔ غیر مذاہب والوں سے بات کرنے میں طریق استدلال اس سے مختلف ہو جاتا ہے ان کے نزدیک قرآن حجت نہیں ہوتا۔ لہٰذا میرا تخاطب ان سے ہے جو قرآن کو حجت مانتے ہیں۔ لہٰذا اگر قرآنِ کریم سے یہ ثابت ہو جائے کہ شرفِ انسانی کی تکمیل، حال اور مستقبل کی سرفرازی و سربلندی، ہر قسم کی فلاح و بہبود اور نجات و سعادت صرف اس نہجِ زندگی (دین) سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا ترجمان قرآنِ کریم اور جس کے عملی پیکر محمد رسول اللہ ہیں تو دنیا اسے کتنی ہی تنگ نظری پر کیوں نہ محمول کرے، آپ کو (دوسروں کے پیمانوں کے مطابق) نگاہ کی ہزار وسعتیں اور قلب کی لاکھ کشادگیاں "اس تنگ نظری پر" قربان کر دینی چاہئیں۔ اگر آپ اس

کے لیے تیار ہیں تو دامنِ خداوندی کے سایۂ رحمت میں آپ کے لیے جگہ ہے۔ اور اگر آپ اسے (معاذ اللہ) فی الواقع تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی خیال کرتے ہیں تو اپنی نگاہ کی وسعتوں کے لیے ایسا آسمان تلاش کر لیجئے۔ جہاں جھوٹے کو جھوٹا کہنا تنگ نظری قرار پائے۔ جہاں ناقص کو ناقص کہنا رواداری کے خلاف سمجھا جائے جہاں سچے سے اس لیے اجتناب کیا جائے کہ اس سے جھوٹے کی دل شکنی ہوتی ہے۔ جہاں حقائق کو اس لیے چھپایا جائے کہ ان کے بے نقاب ہو جانے سے مصنوعی نگوں کے چہرے کا رنگ فق ہو جانے کا ڈر ہے۔ اسلام میں تو حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا ہی پڑے گا، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ جب یہ حقیقتِ ثابتہ ہے کہ آج اس آسمان کے نیچے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام اپنی اصلی اور مکمل شکل میں قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں، تو اس حقیقت کے اعلان سے اس لیے ہچکچاہٹ پیدا ہونا کہ اس سے دوسرے تنگ نظری کا طعنہ دیں گے، اگر خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو راضی رکھنے کا عملی شرک نہیں تو اور کیا ہے۔؟

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ (۲/۱۵۹)

جو لوگ ان باتوں کو چھپا لیتے ہیں جو ہم نے سچائی کی روشنی اور ہدایت سے نازل کی ہیں، باوجود یہ کہ ہم نے لوگوں کے لیے انہیں کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنتیں کرنے والوں کی لعنتیں بھی ان کے حصے میں آتی ہیں۔

جناب آزاد کے معتقدات

جناب آزاد کی محولہ صدر تفسیر تقریباً پونے دو صد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس کے اخیر میں انہوں نے ان طولانی مباحث کو چند صفحات میں سمٹا دیا ہے۔ یہی وہ خلاصۂ بحث ہے جس سے پنڈت سُندر لال جی نے اپنے دعوے کے اثبات میں اقتباسات پیش کئے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لیے ان مقامات کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:-

لیکن قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔

(الف) اس نے نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں اس نے کہا دین خدا کی عام بخشش ہے اس لیے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت کو

دیا گیا ہو اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(د) اس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے، ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لیے اختیار کئے جائیں پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ھ) اس نے بتایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں کو اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے وہ دین حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اس کے لیے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

(و) اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی مشترک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں وہ کہتا ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں لیکن پیروانِ مذاہب سچائی کے منحرف ہو گئے ہیں اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سر نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا تمام مذاہب کی مشترک اور متفقہ سچائی یہی ہے جسے وہ الدین اور الاسلام کے نام سے پکارتا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جلد ۱ صفحہ ۱۶۳-۱۶۲ (۱۹۴۷ء ایڈیشن صفحہ ۲۱۴-۲۱۳)

دوسرے مقام پر شرع و منہاج کے اختلاف کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں یہ اعمال و رسوم نہ تو اصل حقیقت ہیں نہ ان کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے۔ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے لیکن روح و حقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔ (صفحہ ۱۲۷)

(۱۹۴۷ء ایڈیشن صفحہ ۱۸۹)

متعدد دیگر مقامات پر بھی انہی خیالات کو دہرایا گیا ہے (بہتر ہو کہ تفسیر مذکور کا آپ خود مطالعہ کریں اور سیاق و سباق کو ملا کر ملاحظہ کر لیں کہ جناب آزاد کا نظریہ کیا ہے) اس کے بعد یہ دیکھئے کہ قرآن کریم کی رُو سے نجات و سعادت کے لیے صرف خدا پرستی (اللہ کو مان لینے) اور "نیک عملی" ہی کی ضرورت ہے یا ان کے ساتھ رسالتِ محمدؐ پر بھی ایمان کی ضرورت ہے (جس کے ساتھ ہی قرآن کریم پر ایمان بھی لازم آجاتا ہے اور رسالتِ نبیٔ اکرمؐ اور قرآن پر ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ شریعتِ قرآنی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ اسی کا نام "نیک عملی" ہے) یعنی ساری بحث کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ نجات و سعادت کے لیے ایمان بالرسالت اور قرآنی شریعت کا اِتّباع بھی ضروری ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں کُفّار و مشرکین کے علاوہ اہل کتاب کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ پر ایمان کے علاوہ نبی اکرمؐ سے پیشتر کسی نہ کسی رسول، اور قرآن سے پہلے کسی نہ کسی کتاب، پر ایمان رکھتے تھے۔ لہٰذا اگر بحث کو اور مختصر کر دیا جائے تو وہ اس نقطہ میں سمٹ کر آجائے گی کہ کیا قرآنِ کریم کی رُو سے اہلِ کتاب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ رسالتِ محمدیہ اور اتباعِ قرآن پر بھی ایمان لائیں، یا اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر پختگی سے عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر قرآن کریم اہلِ کتاب سے بھی رسالتِ محمدیہ اور اتباعِ قرآن کا مطالبہ کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس کے سوا نجات و سعادت کی کوئی اور راہ نہیں، تو بات صاف ہو جائے گی۔ اس لیے کہ جب اہلِ کتاب سے بھی ان چیزوں کا مطالبہ ہو تو غیر اہلِ کتاب سے یہ مطالبہ اور بھی شدید ہو جائے گا۔

دین سے کیا مُراد ہے؟

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآنِ کریم جس چیز کو دین یا اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ قرآنی تعلیم کا اس باب میں مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے مختلف زمانوں میں، مختلف اقوام و ملل میں، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے پیغامات آتے رہے۔ ان پیغامات کی اصل و بنیاد ہمیشہ ایک رہی۔ یعنی خدائے واحد کی عبودیت، اس کے سوا کسی اور کو اس قابل نہ سمجھنا کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے لیکن اس اصل کو بروئے کار لانے کے لیے عملی نظام کی تشکیل میں مقتضیاتِ زمانہ کے اعتبار سے فرق ہوتا رہا۔ یہ پیغامات آتے۔ کچھ عرصہ تک اپنی شکل میں قائم رہتے۔ اس کے بعد یا تو آفاتِ ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتے یا خود انسانوں کے دستبرد سے ان میں تحریف و الحاق ہو جاتا۔ کہیں یہ فراموش ہی کر دیئے جاتے۔ لہٰذا کچھ وقت کے بعد ان پیغامات کی پھر سے تجدید ہو جاتی۔ انہیں جیسے پیغامات (آیات اللہ) کا پھر

نزول ہو جاتا۔ اس کے بعد ہی ایک اور حقیقت بھی تھی یعنی انسانیت خود اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی لہٰذا اس کے مقتضیات اور ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس لیے ہر زمانے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق نظامِ خداوندی کی تشکیل کے عناصر میں بھی ارتقائی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یعنی ہر رسول کے وقت کچھ تو گزشتہ رسول کے فراموش کردہ یا ضائع شدہ پیغامات (احکام) کی تجدید ہو جاتی تھی اور کچھ ان پر اضافہ بھی ہو جاتا تھا، اور ترمیم و تنسیخ بھی۔ لیکن یہ ترمیم و تنسیخ ہمیشہ ارتقاء و عروج کی طرف لے جاتی تھی تنزل و ہبوط کی طرف نہیں جاتی تھی۔ ذیل کی آیت مقدسہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے فرمایا:۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ (۲/۱۰۶)

(ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں۔

یعنی منسوخ شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس سے بہتر اور فراموش شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس جیسا حکم آ جاتا تھا چنانچہ قرآن میں کتبِ سابقہ میں الحاق و تحریف کی تصریحات متعدد مقامات پر مذکور ہیں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ سو اس میں اختلاف ڈالے گئے) يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (وہ کلمات کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور جو کچھ انہیں یاد دلایا گیا تھا اس میں سے ایک حصہ انہوں نے بھلا ہی دیا) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۲/۷۹) (افسوس ہے ان پر جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

اس قسم کے متعدد مقامات میں تحریف، الحاق، فراموشی، دانستہ تغیر و تبدل کی تصریحات موجود ہیں نیز اس حقیقتِ باہرہ پر خود دنیا شاہد ہے۔ آج دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس دعوے کو بہ دلائل ثابت کر سکے کہ جس کتاب کو وہ صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو ان کے پیغمبر پہ نازل ہوئی تھی اس کے برعکس اس امر کے لیے بے شمار تاریخی شہادات موجود ہیں کہ ان کتابوں کے اصل نسخوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا[1] بہرحال یہ سلسلۂ رشد و ہدایت یونہی جاری رہا تا آنکہ دنیا اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر سنِ رشد و بلوغ کو پہنچ گئی۔ اب مشیتِ ایزدی کے اندازے کے مطابق وہ وقت آ گیا کہ ان تمام حقائق کو جو اس سے

[1] ان امور کی تفصیلات کے لیے "معراج انسانیت" کا پہلا باب دیکھئے۔

پیشتر حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے دنیا میں بھیجے گئے تھے، اور جو یا تو بالکل ضائع ہو چکے تھے۔ ان میں تحریف والحاق ہو چکا تھا، ان کی اصلی شکل میں ایک جگہ جمع کیا جائے پھر ان تمام احکامات کی جگہ جو وقتی طور پر آئے تھے ایسے احکامات دے دیئے جائیں جو قیامت تک کے لیے انسانی ضروریات کے لیے مکتفی ہوں۔ اس طرح ان تمام حقائق واصولات کو یکجا کر کے اسے محفوظ طریقے پر دنیا کو دے دیا گیا اور اسے قیامت تک کے لیے محفوظ رکھنے کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا۔ مجموعۂ حقائق اور ضابطۂ خداوندی کے اس (LATEST) اور آخری ایڈیشن کا نام قرآن ہے۔ اب ساری دنیا میں اعلان کر دیا گیا کہ ہماری نعمتیں مکمل ہو گئیں۔ ضابطۂ حیاتِ انسانی کو آخری ترتیب دے دی گئی۔ تمام سابقہ سچائیاں اس کے اندر آگئیں۔ اب نجات وسعادت کے لیے صرف یہی ضابطہ قولِ فیصل ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ جہاں ہے منسوخ ہے۔ اب دین ہے تو یہی، اسلام ہے تو اسی کا نام۔ ایمان ہے تو اس پر۔ اس کے باہر نہ کہیں دین ہے نہ اسلام، نہ شریعت ہے نہ منہاج۔ یہ اس خدا کا اعلان ہے جس نے ان پیغامات کو بھیجا جو اس سے پہلے نافذ العمل تھے۔ اسی نے ایک کی جگہ دوسرے کو بھیجا۔ اسی نے ان تمام کو سمٹا کر اس ایک میں جمع کر دیا، اور ان تمام کی جگہ اب صرف اسی ایک کو اپنا ضابطۂ قوانین قرار دیا۔ اسی نے اس بات کا حکم دیا کہ اس حقیقت پر ایمان لاؤ۔ کہ اس سے پیشتر جتنے انبیاء کرام تشریف لائے وہ اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے۔ جو پیغامات انہوں نے دیئے وہ بھی خدا کی طرف سے نازل شدہ تھے۔ نہ نبی ہونے کی حیثیت سے ان حضرات انبیاء کرام میں کوئی فرق ہے نہ پیغاماتِ خداوندی ہونے کی جہت سے ان پیغامات میں کوئی اختلاف تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اسی خدا نے فرما دیا کہ اب اتباع واطاعت صرف اسی مجموعۂ قوانین کی ہو گی جس کا نام قرآن کریم ہے۔ یہ ہے الدِّین اور یہ ہے الاِسلام۔ اسی کا ہر انسان سے مطالبہ ہے اور اسی سے نجات وسعادت وابستہ۔ یہ کہنا درست ہے کہ سچائیاں اپنے اپنے وقت میں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود تھیں۔ لیکن یہ کہنا سراسر خلافِ حقیقت اور خلافِ قرآن ہے کہ اصل دین ہر مذہب میں یکساں موجود ہے۔ (ترجمان القرآن۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۳۷)

"موجود تھیں" اور "موجود ہے" میں زمین وآسمان کا فرق ہے اور یہی فرق ہے جس پر اس جدید نظریہ کے حق وباطل ہونے کا انحصار ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے سارا معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔

ایمان سے مفہوم

اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن کا بنیادی مطالبہ ایمان کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایمان سے مراد صرف ایمان باللہ (خدا پرستی) ہی ہے یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی۔ قرآن نے ایمان کے پانچ اجزاء بتائے ہیں:۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ج (۲/۱۷۷)

بلکہ نیکی اس کی ہے جو اللہ، آخرت کے دن، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لائے۔

انہی اجزائے ایمانیہ کا انکار کفر اور صریح گمراہی ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ (۴/۱۳۶)

اور جو کوئی اللہ اور اسکے ملائکہ اور کتب، رسل اور یوم آخر سے انکار کرے تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

لیکن قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر ان اجزاء کو بالتفصیل بیان کرتا ہے اور بعض مقامات پر اس کی تفصیل کی بجائے اجزائے ایمانیہ کا اجمالی تذکرہ کر دیتا ہے، اور سیاق و سباق اور نفسِ موضوع کے اعتبار سے جس جزو پر زور دینے کی ضرورت ہوتی ہے صرف اسی کو بیان کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ صرف اللہ پر ایمان کا ذکر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۴۱/۳۰)

یقیناً جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوں گے۔

متعدد مقامات پر صرف اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہی کا ذکر ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ (۲/۶۲)

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آیا اور اس نے عمل صالح کئے تو ان کا اجر ان کے اللہ کے ہاں ملے گا۔

(باقی صـ ۲۲ پر)

Dear Readers,

We have pleasure in reproducing a thesis written by Miss Shamim Anwar, of Kinnaird College, lahore, under the title "Sir Syed Ahmad khan as an Educationist", who, herself a teacher, is one of the most industricus students of the late Mr.G.A.Parwez.

As the title suggests, this is a serious and honest effort at rediscovering the type of education our upcoming generations need!

Idara-e-Tolu-e-Islam.

FOREWORD

A long research paper on "Sir Syed Ahmed Khan as an Educationist" was written in partial fulfillment of the requirement for the degree of Masters in History at McGill University, Montreal, Canada, in the year 1974.

Lately, sudden interest in Sir Syed Ahmed Khan has been evinced at the highest governmental level. Plans for the establishment of "Sir Syed Ahmed University" have been talked about a great deal. The term," Nai Roshni Schools" or "New light" is again borrowed from Sir Syed. There is every danger of the term becoming meaningless through repetition and without the results that Sir Syed aimed at, being in evidence.

In addition to all this, the controversy over medium of instruction that has been raging for the last decade, needs to be seen from hindsight, unemotionally.

This long research paper has been dug out after all these years to help focus attention on Sir Syed Ahmed's view on various aspects of education and the spirit behind them. I hope this small effort will prove to be useful in untying many knots.

At this stage I cannot help striking a personal note on the subject. In my numerous meetings and discussions with Allama G.A. Parwez, my guide and mentor, I was exhorted to study Sir Syed's age and times (of course alongwith *Iqbal's and Jinnah's role in the freedom movement*). Not only has Sir Syed shown tremendous depth and profundity in the understanding of the Quran, explained Parwez, but also shown unique and keen insight into the socio-economic conditions of the times he lived in. During the course of my writing this paper, this comment has been highly vindicated, even though I have barely touched the fringe of his thought and personality.

93-Jail Road,
Lahore.
July, 1987.

S.A.

CHAPTER I

INTRODUCTION
THE FALLEN NATION

In 1857, the year of the "Mutiny", the Muslims of India lay prostrate and bleeding at the feet of the conqueror. The defeat, complete, and gory with heavy reprisals, threw them reeling into a state of hopelessness; but it also shocked them out of their somnambulance into the realisation that politically they had ceased to exist. As the last of the Mughuls, Bahadur Shah Zafar, jolted on his humiliating journey towards Rangoon, the legal myth of the Mughul sovereignty was exploded and Queen Victoria proclaimed the Empress of India. This was, of course, a change in name only of what was already a fact for many a decade. Stage by stage, by means now dubious, now cruel and violent, the Muslims were denuded of their political, military, civil, judicial, and economic power and all their traditional educational facilities and resources. They were already a fallen nation, headed by an Emperor whose presence was not effective even within the four walls of the Red Fort in Delhi, and who, a pensioner of the East India Company, was found pleading helplessly for a raise in his pension. He was indeed a befitting symbol of his people.

In describing the condition of the Muslims in India at the time, W.W. Hunter's "The Indian Mussalmans" first published in 1871, remains still the most outstanding contribution on the subject. Although he has written mainly on his observations and experiences of the Muslims in Bengal, the book is easily applicable to the other parts of the Sub-continent as well. "At Murshidabad", he writes, "a Muhammadan Court still plays its farce of mimic state, and in every District the descendant of some line of princes sullenly and proudly eats his heart out among roofless palaces and weed-choked tanks. Of such families I have personally known several. Their ruined mansions swarm with grown-up sons and daughters, with grand-children and nephews and nieces, and not one of the hungry crowd has a chance of doing anything for himself in life. They drag on a listless existence in patched up verandahs or leaky outhouses, sinking deeper and deeper into a hopeless abyss of debt, till the neighbouring Hindu money-lender fixes a quarrel on them, and then in a moment a host of mortgages foreclose, and the ancient Mussalman family is suddenly swallowed up and disappears for ever."[1] This description is pathetic enough but what is more pathetic is when "If any statesman wishes to make a sensation in the House of Commons, he has only

1 W.W. Hunter, "The Indian Mussalmans" page 131.

to truly narrate the history of one of these Muhammadan families of Bengal."[2] Hunter goes on to give details of the number of Muslims employed in civil, military, judicial and revenue departments in the expanding hegemony of the East India Company and the post-"Mutiny" period of the British Rule. The number is atrociously insignificant in every department indicating that chances for career almost did not exist so much so that "there is now scarcely a Government Office in Calcutta in which a Muhammadan can hope for any post above the rank of porter, messenger, filler of ink-pots, and mender of pens."[3] This caused "such an everlasting despondency" that some Orissa Muhammadans petitioned the Commissioner Mr. E.W. Molony, saying "that we would travel into the remotest of the earth, ascend the snowy peaks of the Himalayas, wander the forlorn regions of Siberia, could we be convinced that by so travelling we would be blessed with a Government apointment of ten shillings a week."[4] The poignancy of the situation becomes more acute when it is known that "A hundred and seventy years ago it was almost impossible for a well-known Mussalman in Bengal to become poor, at present it is almost impossible for him to continue rich".[5] This comment made by Hunter epitomises the equation between the British and the Muslims, the ruler and the ruled in the nineteenth century. Being the former conquerors and rulers for almost a thousand years, the Muslims had monopolised high military, civil and judicial posts. As the political power and sovereignty was wrested from them, all these avenues were blocked. What made it worse was the psychological barrier of mutual distrust accentuated by the brutal atrocities committed by both on each other during the "Mutiny". The Muslims could not be trusted anymore in the Army; they could not be made responsible for any high civil office. And it was not only a question of government service. The Resumption of Land and forfeiture of Trusts, dedicated to education,[6] by means that could not be described fair by any standard, adversely effected a very wide range of economic and educational activities. Replacement of Persian by English as the official language in 1829 was like hitting the last nail in the coffin. Without the knowledge of the English language the Muslims were knocked out of all political and official participation in the country. But then, the Muslims themselves stood on the wayside in aloof and haughty disadain, refusing to trade with the enemy, refusing to serve him, refusing to learn the English language, refusing to step into a new world that the change of masters was ushering into the country. To a very great extent all this is understandable. It is not very easy to accept a servile role after having

2 Ibid page 132.
3 Ibid page 145.
4 Ibid page 150.
5 W.W. Hunter, "The Indian Mussalmans" page 134.
6 More will be said about education in a later Chapter.

determined the destiny of the country for many centuries. This attitude can be further crystalised and understood when compared with the Hindu attitude, who readily cooperated with and accepted the British presence because for them their freedom was not newly lost. For them it was merely a change of masters.

The question that arises from the description of Muslim condition in 1857 is a deeper one and more fundamental. Why did this happen? The Muslims lost everything as we have seen above, but this loss, so vividly and poignantly narrated by Hunter, so well-conversant as he was with the feelings and condition of the Muslims, is still at best an outward manifestatiohn, an external expression in the concrete material sense of what was lost within the mind or what may be defined as a particular approach towards life. After all, as Hunter has argued, the Muslims were not inferior as people. "The Truth 1s", he says, "The Mussalman were the superior race, superior not only in stoutness of heart and strength of arm, but in power of political organisation and in the science of practical government."[7] Obviously then, something had gone wrong or was wrong long before the actual political decline and fall began. Their political extinction was only the natural and logical sequence to certain destructive elements that had crept into their way of thinking, corroding their mental and creative energies. The resultant social and political evils became so widespread that the nation moved steadily towards its doom.[8]

Although militarily and at times even politically some Muslim Kings had shown tremendous vigour and innovation during their supremacy in India, the fact remains that they and the general body of the Muslim people lacked intellectual curiosity and the desire to probe into the mystries of Nature. "The political system which came to dominate the Muslim world was not conducive to free intellectual growth. The result was that not only progress stopped, but there was actual regression, resulting in increasing loss of objectivity, moral courage and intellectual curiosity."[9] Babar was enthralled by the beauty in Nature and attempted to live close to it as much as possible, but his appreciation was limited to his aesthetic sense only. Then again, although he introduced gunpowder in India, there was no further development in military equipment during his time or after him. The Mughal helplessness on the sea was pathetic ever since the days of Akbar. It were the Portugese who gave safe-conduct to the pilgrims sailing to Mecca. It is indeed surprising that a curious and open-minded Akbar did not take any meaures, although he was the first Mughal Emperor to have seen the sea, was in contact with Europeans and was aware of the limitation of his "navy". He

7 Ibid page 145.
8 Shahid Hussain Razzaqi "Sir Syed Aur Islahi Muashra" page 10.
9 S.M. Ikram, "History of Muslim Civilisation in India and Pakistan" page 442.

foresee the possibilities of the printing press, and what it could do for and enlightenment. This was so in spite of the fact that Babar and were the most illustrious and dynamic of their dynasty. Thus "An unchanging sameness pervades the ages", says Tasadduq Hussain. "Time rolls on from century to century, dynasties rise and fall, the political world is full of storm and stress, but they leave the world nearly the same as they found it."[10] The face that the Muslim India showed to the world was immobile. The courtiers in the palace were the "yes" men of the time, servile and unthinking. The people as a whole were mortally afraid of change. Everything, every idea, every institution they were born into was sacred and untouchable and hence unchangeable. This mental attitude was upheld and protected by the 'Ulema' and in alliance with the powers that be they maintained the status quo. To achieve this they kept the nation at a high emotional pitch, arousing them against anyone that dared question the establishment. This kind of an approach took deeper roots after the failure of the "Mutiny" in the form of ancestor worship. To the Muslims at this stage of their history, their ancestors were the perfect people who had created the perfect world. Theirs was the last word. The various concepts, institutions, and usages that they lived in and perfected, must be revived or retained, as the case may be, exactly in the forms the ancestors had left them. They must shun the present and live in the glorious past, an eternal theme that was embellished by many a poet and good humouredly bantered about by E.M. Forster in his "Passage to India". Perhaps this is the characteristic of the poetry of the fallen nation, a nation that is afraid to face the tomorrow, for it is dark and unknown and frightfully risky. An escape into the past is familiar territory and hence comfortable. It was an extension of this very mood that Muslims were afraid to venture forth on the high seas and distant lands. They just withdrew into their shells.

One of the worst features of the declining period was the loss of joy in the world around. The beauty of Nature that thrilled Babar and Jahangir no longer seemed beautiful to their descendants. Their eyes, ears and noses atrophied to all beautiful sights, sounds and smells. Actually for them this world had no values of its own, their gaze was fixed on the hereafter. Life thus became drab, ugly and uncreatively monotonous. All creative activity which had blossomed in the form of craft, artisanship, arhitecture and music, to mention the best in the Mughul heritage, was now reduced to blind repetition, generation after generation and in the same families and castes. Creativity as a human potential, even in the innocent arts as mentioned above became taboo. Everything beautiful was "haram" according to the "fatwa" of the "Ulema". Life became uncouth and

10 Tasadduq Hussain "Hali, The Poet, the Critic and the Biographer" page 1.

devoid of culture, and inevitably ended up in occupations that were unproductive and unaesthetic, bordered on emptiness and perversity.

Lucknow, the capitl of Awadh, which was supposed to be modelled on the Mughul Court of Delhi and which attracted away its people during the twilight of the Mughuls, became the symbol of this decadent culture. Literature of the time accepted no social responsibility and it expressed no humanitarian interests. With an exception here and there, it smacked of defeat and exhaustion and escapism from the grim realities of life.[11] Graham Bailey says: "Lucknow poetry reflected the court. It gave itself upto external things, such as outward ornament, rather than beauty of thought. It developed rules for language and idiom, restricted poetic licence and laid down laws for prosody and figures of speech, especially similies and metaphors. Vigour of style and depth of thought counted for little, verbal accuracy and idiomatic use of words were the ideal".[12] In Darse-Nizamiyah of Lucknow "More attention was paid to the form than to substance."[13] In fact all theological instruction was scholastic and obscurantist and sectarian. It did not touch the head and the heart of the student. The life force was left unmoved allowing it to stagnate and fossilise itself. Percy Brown describes Lucknow architecture as works of "outward show and tawdry pretence" whose "style has no spiritual values."

Thus literature, theology and architecture are some examples to show the inner defeatest mentality of the later Mughuls, in the light of which alone can the work of Syed Ahmed Khan be fully comprehended, and his educational policy properly studied. However, this is not the end of the story of the fallen nation: This failure to respond to the challenge of life found a rationale and a justification in the philosophy of fatalism or "taqdir". All calamities were preordained by God, and no individual or collective respobsibility was recognised, for human effort in any case is of no avail. "With this disintegrating and enervating doctrine," Says Tasadduq Hussain, "their self-complacency led them to the fantastic notion 'that Allah was on the side of the Mussalmans without being sure that they were on the side of Allah.!"[14]

An equally enervating doctrine was that of mysticism or "Sufisim", a version of neo-Platonism that had been gaining ground. It talked about the unreality of this world, about a vague emotional link with God and the ultimate merger into Him; it glorified death and bred pessimism among its believers. All

11 Tasadduq Hussain "Hali, The Poet, the Critic and the Biographer" page 6.
12 S.M. Ikram, "History of Muslim Civilisation in India and Pakistan" page 390.
13 Ibid page 390.
14 Tasadduq Hussain "Hali, The Poet, the Critic and the Biographer" page 7.

this led to ascetism and other-wordliness.[15] Sufis and Saints abounded with hosts of followers or "mureed" all over the length and breadth of the country. In fact Bahadur Shah himself was more of a Sufi to his people than a king. Having lost their virility, unable to cope with their own sense of defeat they shut their eyes in mysticism to the impending calamity, thinking they were safe by rejecting the world. They did not realise that if they rejected the world, the world was going to reject them.

When it comes to escaping from despair and the selfcreated ugly environment, it can find other channels of escape as well, channels of depravity and licentiousness, of which Lucknow was again the focus, along with Delhi and other towns. There were others who took shelter in tawdry tinsels and sham shows. C.F. Andrews has given an interesting account of this about life in Delhi. "Festivals were common", he says, "and they were kept with great pomp and ceremonial. Processions through the city were almost a daily occurance during the marriage season, and immense sums of money were spent in wedding festivities and decorations ___ Bright coloured clothes were the fashion, and the nobles especially rivalled one another in their splendid costumes ..... The horses on which the nobles rode through the streets of the city, had gorgeous trappings, and there were frequent cavalcades with tinkling bells and costly equipage ......"

"The finest sight in streets, which was in a certain sense the pride of the inhabitants of Delhi in those by-gone days, was to watch the royal elephants, covered with cloth of gold, with huge gilded howdahs on their backs, and they were led in a stately, slow procession through the streets."[16] Such were the empty shows and such was the waste of wealth while the nation was dying. Young men wasted their time in the streets flying kites, cock-fights, archery and watching processions when they should have been going to good schools and colleges. Syed Ahmed was keenly aware of this for he himself had seen it all. Hadi Hussain has summarised the situation as follows: "The tone of all-round political and social decay was, however, set by the effete court, which was at once a symbol of past glory and a portent of impending disaster. Time-honoured rites and customs and an ultra-conservative attitude of clinging to the dead past appeared to receive official confirmation from the Mughal Emperor and his Court. it was a medley of ritualism, doctrinalism, fanaticism, obscurantism and sectarianism, passing for religion among the Muslims which Shah Abdul Aziz and other successors of Shah Waliullah addressed themselves to rectifying. In any case, participation by the royal family in the social life of Delhi in its festivals, fairs and processions, its cock-fights and competitions of kite-flying,

---

15 Ibid page 7-8.

16 Quoted by Percival Spear in "Twilight of the Mughuls" page 198-199.